پریل

ماہ نامہ

اردو دنیا نئی دہلی

"ملک کے اتحاد اور اس کی بھرپور ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اردو کو پھلنے پھولنے کا بھرپور موقع ملے اور اسے فروغ دیا جائے کیوں کہ یہ ایسی زبان
ہے جو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی ترجمان ہے اور اس سے پورے ملک میں باہمی میل جول، قومی ہم آہنگی اور سیکولر فکر کو مضبوطی ملتی ہے۔
[illegible] اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اردو کی اہمیت کے پیش نظر وزارت ترقی انسانی وسائل ترجیحی بنیاد
[illegible] کی کوشش کرتی ہے۔"

[illegible]

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ ثانوی و اعلا تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

قومی اردو کونسل کی جانب سے 27 رفروری تا 6 رمارچ 2005 جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انصاری آڈیٹوریم گراؤنڈ میں دہلی اردو کتاب میلے کا انعقاد کیا گیا۔ تصویر میں کتاب میلے کا افتتاح کرتے ہوئے پلاننگ کمیشن کی ممبر محترمہ سیدہ حمید، ساتھ میں (دائیں سے) ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر مشیر الحسن اور محترمہ ساجدہ بیگم۔

کتاب میلے کی افتتاحی تقریب کے موقعے پر لی گئی سامعین کی ایک تصویر۔

ماہ نامہ

اردو دُنیا نئی دہلی

جلد۔7، شمارہ۔4   اپریل 2005

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

معاون مدیر: فیروز عالم

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلا تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: قومی اُردو کونسل

مطبع: جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی 6

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اُردو کونسل

قیمت -/10 روپیے، سالانہ -/100 روپے

چیک یا ڈرافٹ NCPUL کے نام روانہ کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی - 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657   26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 6-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... خطوط 2
ہماری بات .... اداریہ 5
● ترقی پسند تحریک .... مہمان اداریہ 6
● اے۔ کے ہنگل سے گفتگو .... فیروز عالم 7
● نصاب اور قومی یکجہتی .... غلام نبی مومن 9
● اردو تعلیم: کیفیت اور تدابیر .... عثمان شاہد 11
● مولانا عبدالماجد دریابادی کی صحافتی خدمات .... عبدالعلیم قدوائی 13
● اردو صحافیوں کی تربیت کا مسئلہ .... تسیم عارفی 15
● بچوں کی تعلیم و تربیت .... محمد فاروق اعظمی 17
● ہم خواب کیوں دیکھتے ہیں .... شیفالی واسدیو 19
● عظیم گلوکارہ — ایم. ایس. سبّو لکشمی .... سید امتیاز الدین 22
اتہاس کے جھروکے سے:
● کشان سلطنت .... مدن گوپال 27
گوشۂ ادب:
● جذبی کی یاد میں .... رفعت سروش 30
● موت (نظم) .... معین احسن جذبی 33
● غزل .... معین احسن جذبی 33
● دہشت زدہ (کہانی) .... عابد سورتی 34
گوشۂ فروغ کتب
● غالب اور انقلاب 1857 (''انقلاب 1857'' سے اقتباس) .... کے. ایم. اشرف 40
● خطاطی اور خوش نویسی (''جامع اردو انسائیکلوپیڈیا'' سے اقتباس) 45
طلبہ کے لیے
● پاور پوائنٹ کا تعارف .... امیت جین 51
● سائنس (کوئز) .... عزیز احمد ہاشمی 53
● بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-21) .... جاوید اقبال 56
دہلی اردو کتاب میلہ (رپورٹ) .... فیروز عالم 57
اُردو خبرنامہ .... ادارہ 62
تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 71
● تاریخ ٹیپو سلطان / محب الحسن .... مبصر: ظفر احمد نظامی
● جدید ہندوستان (1947-1885) / سُمِت سرکار .... مبصر: اسعر فریدی
● بجلی کی کہانی / اے. کے. چکرورتی، ایس. بی. بھٹاچاریہ .... مبصر: عبدالرب
● اردو تعلیم اور اسکول / فیروز بخت احمد .... مبصر: رئیس احمد
● صدائے آبجو / ارشد عبدالحمید .... مبصر: ارشد علی خاں
بچوں کا گوشہ
● میری کیوری (''سائنس دانوں کی کہانیاں'' سے اقتباس) .... بلراج پوری 77

آپ کی بات

■ جی.ڈی.چندن، جی-46، جنگپورہ ایکسٹینشن، نئی دہلی-110014

''اردو دنیا'' میں ہندستان کی تاریخ پر مدن گوپال صاحب کی ایک نہایت معلوماتی اور دل چسپ انگریزی کتاب Turning Points of Indian History کا ترجمہ شائع کیا جارہا ہے۔ یہ سلسلۂ مضامین اکتوبر 2004 کے شمارے سے شروع ہوا تھا جس میں مصنف نے بتایا ہے کہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے اوائل میں کی جانے والی مغربی محققین کی تحقیق سے ہندستان کے قدیم زمانے کے بارے میں کچھ معلومات دریافت ہوئی تھیں لیکن بدقسمتی سے 1930 کی سرد بازاری کے بعد واقع ہونے والی مالیاتی پابندیوں کی وجہ سے یہ کام رک گیا۔ ملک تقسیم ہوگیا اور اس سلسلے کو آگے بڑھانے کی کوئی موثر تدبیر نہ کی گئی۔

اس شمارے میں آپ نے اپنے ادارتی نوٹ میں متذکرہ کتاب کو ہندستان کی تاریخ کے بدلتے ہوئے دھاروں پر ایک بے حد اہم کتاب قرار دیا تھا اور اس کا ترجمہ ''ہندستانی تاریخ کے اہم موڑ'' کے نام سے قسط وار شائع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ لیکن اکتوبر کے شمارے ہی سے اس کو ''اتیہاس کے جھروکے سے'' میں بدل دیا گیا اور مشمولات کی فہرست اور مضمون کی پیشانی پر بھی یہ تبدیل شدہ بے جوڑ عنوان ہی چل رہا ہے اور اب فروری 2005 کے شمارے میں اسے مضمون کی پیشانی سے غائب کردیا گیا ہے۔

فروری کے شمارے میں سکندر اعظم کے حملے کا پس منظر اور احوال پیش کیے گئے ہیں۔ آج تک تاریخ کے اکثر قاری اسے علاقائی اقتدار کے ایک فوجی حملے ہی کی صورت میں دیکھتے رہے ہیں لیکن ''اردو دنیا'' کے اس فیچر سے ماضی قدیم میں ہندستان کے علم و فلسفے کی پذیرائی اور اس کے بین الاقوامی تعلقات کے کئی نئے پہلو اور نئے زاویے سامنے آئے ہیں۔ تاریخ کا یہی مقصد ہے کہ یہ اسکولی طالب علم کی رٹائی نہ بنے بلکہ ایک نئے انداز فکر کا مرکز بنے۔ آپ کا یہ فیچر یہی کام کررہا ہے۔

بہرحال اس دوران میں میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ کی نیک اور مفید کوششوں کا وہ نوٹس نہیں لیا گیا جس کی یہ مستحق ہیں۔ اس ضمن میں ''کلیات پریم چند'' کی اشاعت ایک نمایاں مثال ہے۔ تازہ شمارے میں علی گڑھ کے ایک مقتدر مراسلہ نگار نے بجا لکھا ہے کہ کونسل کس طرح اردو زبان کے ادبی سرمایے میں اضافہ کررہی ہے۔ (صفحہ-2)

بعض حلقوں کی طرف سے گزشتہ دنوں اخباروں میں یہ شکوہ ہوتا رہا کہ ہندستان کے عہد ساز حقیقت نگار ادیب پریم چند کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ حیرت ہے کہ ان حلقوں کے عالم فاضل لیڈر، اپنے متعدد اردو مشیروں کے باوجود، قومی اردو کونسل کے ''کلیات پریم چند'' کا جس کی تقریبات کا اردو پریس میں مسلسل شہرہ رہا ہے، کوئی نوٹس نہ لے سکے۔ ہمارے شاعر میر نے آج سے صدیوں پہلے ایسے ہی موقعے اور منظر کے لیے کہا تھا:

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

بہرحال ہندستانی تاریخ کے اہم موڑوں پر آپ کے خصوصی فیچر نے بڑی خوبی سے یہ یاددہانی کرائی ہے کہ عہد مسیح سے ہی قدیم یونان کے شہرۂ آفاق فلسفیوں اور ریاضی دانوں، افلاطون اور پائتھاگورس کے تاریخی نظریات پر ہندستان کی فکری امارت کا اثر تھا۔ ان حقائق کے فروغ سے آج کی نسل کے علمی سرمایے کو معمور ہونا چاہیے۔ آج ہم عالمیت (Globalisation) کی ضرورتوں کو مغرب کے چند نظریوں اور پروپیگنڈے سے منسلک کررہے ہیں لیکن ہندستان نے جدید مغرب کے خالق عہد مسیح سے بہت قبل اس کی ثمر آور فضا قائم کردی تھی۔ ہندستان کی قدیم ترقی اور تہذیب کے بارے میں اس فیچر کے مطالعے

جناب شمس الرحمن فاروقی کو کونسل کا وائس چیئرمین مقرر کیے جانے پر مختلف افراد نے تہنیتی خطوط لکھے ہیں۔ ان میں سے چند خطوط قارئین ''اردو دنیا'' کے لیے پیش ہیں۔

■ سید عابد، تعلیم آباد، سنگم وہار، نئی دہلی-62

خدا کرے کہ آپ کا دوسرا دور پہلے سے زیادہ کامیاب ہو۔ ترقی اردو بورڈ کو اس کے پہلے دور میں آپ نے سدھارا تھا، سنوارا تھا۔ اس وقت آپ اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی مراحل میں تھے۔ بفضلہٖ آپ اب اوج کمال تک پہنچ گئے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات ہے کہ راست روی، اثر پذیری اور بے باک دامنی کے لیے آپ کی شہرت چند ہوگئی ہے اور آپ سے توقعات بھی آپ کے انتخابات کے بقدر بڑھ گئی ہیں۔ پروردگار آپ کو صحت اور طمانیت اور عزم مصمم سے نوازے۔ آمین! آپ کے عقیدت مندوں کو یقین واثق ہے کہ آپ کا یہ دور عہد ساز ہوگا اور کونسل کو آپ ایک نیا رخ دے کر اردو زبان کی ترقی کے لیے زیادہ کارآمد بنا سکیں گے۔

■ عبدالودود اظہر، انجمن استادان فارسی ہند، 98، حاجی بھون، صدر بازار، دہلی-6

قومی اردو کونسل کا وائس چیئرمین مقرر کیے جانے پر بے حد مبارکباد۔ ہمیں توقع ہے کہ آپ کی سرپرستی میں قومی اردو کونسل مزید ترقی کرے گی اور اردو زبان تعلیمی و عوامی میدان میں اپنا جائز مقام حاصل کرے گی۔

عربی و فارسی جیسی کلاسیکی زبانیں اپنی ترویج و ترقی کے لیے کونسل سے متعلق ہیں۔ یہ دونوں زبانیں تعلیمی میدان میں بھید بھاؤ اور تعصب کے باعث بذات خود ترقی نہیں کرسکتیں۔ وہ کونسل کے توسط سے حکومت کی خصوصی توجہ اور آپ جیسی شخصیت کی جو

سے رو نگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غور فرمائیے کہ سکندر اپنا سامراج قائم کرنے کے لیے وادیِ سندھ میں آیا۔ اس کی فوج نے ہندستان کی اندرونی پھوٹ کی وجہ سے ایک ابتدائی فتح بھی حاصل کرلی لیکن اس کے بعد مضمحل ہوگئی اور سکندرِ اعظم گھر لوٹتے لوٹتے دم توڑ گیا۔ اس کے جانشیں جرنیل سیلوکس نے اپنی بیٹی کی شادی ہار جانے والے پورس کے جانشیں چندر گپت سے کی جس کے وزیرِ اعظم چانکیہ کی حکمتِ عملی اور دانش مندی کا معیار عہد ساز اور لاثانی تھا۔ زمانۂ مسیح کے آغاز سے سیکڑوں برس قبل ہندستانی فلسفہ اور منطق بلندی پر تھی اور دیگر علم دوست ممالک اس سے استفادہ کرنے کے لیے کیا کیا ہفت خواں طے کرتے تھے اس موضوع پر یہ سلسلۂ مضامین معرکتہ الآرا ہے۔

پنڈت نہرو کی Discovery of India جس پر شیام بینیگل نے ''بھارت کی کھوج'' کے عنوان سے ڈاکومینٹری بنائی تھی، اس کی طرح آپ کا فیچر بھی ایک یادگار فلم کے اجزا سے مالا مال ہے۔ ''اردو دنیا'' کو حکومت ہند کے فلم ڈویژن کی توجہ اس طرف دلانی چاہیے۔ قوی امید ہے کہ کتاب کے مصنف مدن گوپال صاحب اس کی اجازت دے دیں گے۔

"اتیہاس کے جھروکے سے" رسالے کا ایک مستقل کالم ہے جس کے تحت تاریخی موضوعات پر مضامین "اردو دنیا" میں شائع کیے جاتے ہیں، ہم نہیں سمجھتے کہ یہ عنوان "بے جوڑ" ہے۔ اگر ایک ہی کتاب سے مسلسل اقتباسات ماہ بہ ماہ دیے جارہے ہوں، جیسا کہ اس کتاب سے دیے جارہے ہیں تو یہ ذیلی عنوان حذف بھی کیاجاسکتا ہے، لہٰذا اہمیت اصل عنوان کی ہے۔ فہرست اندراجات میں ذیلی عنوان کے تحت ہی، اصل عنوان دیا جاتا ہے۔

آپ ہمارے کاموں کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں اس کے لیے ہم آپ کے ممنون ہیں۔ (ادارہ)

دونوں زبانوں کی اہمیت و معنویت سے واقف ہیں [illegible] دونوں زبانوں میں تحقیق اور مطالعہ ضروری ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کی رہنمائی میں [illegible] بآسانی حاصل کر لیں گی۔

■ [illegible] ہائی اسکول، [illegible] 440018

پوری اردو دنیا واقف ہے کہ آپ کسی اعزاز [illegible] کے خواہاں نہیں بلکہ مناصب و اعزازات آپ کے خواستگار رہتے ہیں۔ [illegible] آپ کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا وائس چیئرمین بننے پر ادارے کی جانب سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ یقین ہے کہ آپ کی تقرری سے کونسل کو ایک نئی تحریک و توانائی ملے گی۔

■ بشیر احمد مدیر "عصری آگہی" اے 78/ بی 3، دلشاد کالونی دہلی-95

قومی اردو کونسل کے نائب صدر کے عہدے پر تقرری کے لیے مبارک باد۔ آپ میں بے پناہ صلاحیتیں ہیں۔ موجودہ ڈائرکٹر بھی صاحبِ صلاحیت ہیں اور آپ کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ ان دنوں مرکزی سرکار کی سیاسی قیادت بھی اردو مخالف نہیں۔ اگر گروہ بندی اور دوسرے ذاتی اختلافات نظر انداز کرکے اردو کے لیے کام کیے جائیں تو ہندستانی عوام اور خاص طور پر ہندی علاقے کے مسلمانوں کی پہچان برقرار رہ سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں اساتذہ کی تقرری کے ذریعے روزگار کے مواقع بڑھ سکتے ہیں اور اقتدار میں بھی حصے داری ہوسکتی ہے۔

■ ابوالکلام، اسسٹنٹ ڈائرکٹر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد

اردو کی ترقی کے لیے اس سے بہتر اور کیا ہوسکتا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب جیسا اعلا پائے کا اسکالر اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ جیسا فعال آفیسر اور باکمال ہر دو ایک ادارے میں جمع ہو جائیں۔ ایک بار پھر آپ کو مبارکباد۔

■ ایس۔ایل بھٹناگر، اشوک ہاؤس، بی-59، جنگپورہ ایکسٹینشن، نئی دہلی-14

آپ نے ''اردو دنیا'' کے فروری کے شمارے کا گیسٹ کالم اردو صحافت کی نذر کیا ہے۔ اس مقالے سے پہلی بار کچھ ایسے حقائق سامنے آئے ہیں جن سے اردو صحافت کے بارے میں کئی غلط اندازے برطرف ہوگئے ہیں۔ میں اس کے دیرینہ وابستگان میں ہوں۔ ملک کی تقسیم سے قبل لاہور میں اپنے والد محترم صوفی لچھمن پرشاد، بانی ایڈیٹر، ''مستانہ جوگی'' لاہور کی رہبری اور تربیت کے فیض سے مجھے وہاں کی اردو صحافت سے خاصی قربت رہی۔ تقسیم ملک کے بعد میرا شعبۂ معاش بدل گیا لیکن اردو پریس سے میرا ذہنی رشتہ حسب سابق قائم رہا۔

میرا مشاہدہ ہے کہ اردو پریس ملک کی رائے عامہ کی تشکیل و تہذیب میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ گو آج یہ ویسے مدیران سے سرفراز نہیں جیسے اسے ملک کی تقسیم سے قبل حاصل تھے۔

2002 تک، جب میں یہ پڑھتا رہا کہ ملک میں مختلف وقفوں کے اردو کے ڈھائی ہزار سے زیادہ اخبارات و جرائد ہیں جن کا مجموعی سرکولیشن 50 لاکھ سے بھی زیادہ ہے تو میرا دل بہت خوش ہوا۔ بہ سلسلۂ کاروبار مجھے وقتاً فوقتاً لندن جانا ہوتا ہے جہاں چند پاکستانی ارباب ذوق سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ غالباً مئی 2002 میں انھی میں سے دو احباب نے مجھے پریس ان انڈیا رپورٹ کے تازہ ایڈیشن کے حوالے سے ان اعداد کی امارت پر مبارکباد دی۔ لیکن اب جی۔ڈی۔ چندن صاحب کے مقالے سے معلوم ہوا کہ اپنے تازہ ترین اعداد و شمار میں پریس رجسٹرار کے دفتر کو ملک کے زندہ اردو اخباروں کی کل تعداد 802 ملی ہے جبکہ اپنے تازہ ترین گوشوارے بھیجنے والے اخبارات کی حقیقی تعداد صرف 397 ہے۔ ان دو تعدادوں کے برعکس دفتر کے رجسٹروں میں اردو اخباروں کی کل تعداد 2983 ہے۔ جناب جی ڈی چندن نے صحیح کہا ہے کہ اس فرق اور اخباروں کی نئی تعداد کے سرکولیشن کی وضاحت حکومت کے ذرائع ہی سے ہوسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تازہ سرکاری رپورٹ 03-2002 کے شائع

ہونے سے قبل تک جو ''ابہام اور الجھاؤ'' رہا ہے اُس
شافی ازالہ ہونا چاہیے۔

میں جناب جی ڈی چندن کی اس تجویز کی پرز
تائید کرتا ہوں کہ ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہماری ار
اکادمیوں کو ہر سال اپنی اپنی ریاست کے موجودہ ار
اخبارات و جرائد کی ایک فہرست مرتب کرنا چاہیے
اس سے ایک تو ان اکادمیوں کی مقصدیت میں پسندید
اضافہ ہوسکتا ہے دوسرے کم از کم اردو کی حد تک
انتشار ختم ہوسکتا ہے جو ہماری صحافت کے بارے میں
پریس رجسٹرار کی تازہ ترین رپورٹ کی تین تعدادوں
سے عیاں ہوا ہے۔ یہ سرکاری رپورٹ ہمارے ملک کے کھلے سماج کا ایک روشن ثبوت ہے، لیکن اسے کسی انتشار سے دوچار نہیں ہونا چاہیے۔

■ **پران کپلا، پوسٹ بکس-5235، چانکیہ پوری، نئی دہلی-21**

آپ کے مقبول عام رسالے ''اردو دنیا'' کے فروری کے شمارے میں جناب جی۔ڈی۔ چندن نے اپنے مضمون ''اردو صحافت — 21ویں صدی کے اوائل میں'، اردو صحافت کے آغاز اور موجودہ احوال کی دستاویزی عکاسی کی ہے۔

موجودہ سرکاری اداروں کی اردو صحافت کے تئیں کیا ذمے داری ہے، اس سلسلے میں جو ادارے قائم کیے گئے ہیں، وہ کیسے کام کرتے ہیں، چندن صاحب نے ان پر روشنی ڈالی ہے۔کمپیوٹر نے صحافت کا نقشہ بدل دیا ہے۔ اس بدلتے ماحول میں پریس رجسٹرار کا رول بہت اہم ہے۔ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جو مختلف زبانوں کے پریس سرکولیشن کی صحیح تعداد کا ذمے دار ہے۔

چندن صاحب نے پریس رجسٹرار کی رپورٹ میں زندہ اخباروں کی (خاص طور پر اردو پریس کی) نشان دہی پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ انھوں نے جو دلیل پیش کی ہے وہ غور طلب ہے۔ کیا پریس رجسٹرار جی۔ڈی۔ چندن کی پیش کردہ تجاویز کو عملی جامہ پہنائیں گے، یہ تو آئندہ پریس رپورٹ سے ہی پتہ چلے گا مگر امید کی جاسکتی ہے کہ ان کی تجویز کا نوٹس ضرور لیا جائے گا۔

■ **محمد ہاشم قدوائی، سابق ممبر راجیہ سبھا، 107 ساجارا پارلمنٹ، نئی دہلی**

''اردو دنیا'' کا فروری 2005 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ جی۔ڈی۔ چندن صاحب کا معلوماتی مضمون ''اردو صحافت اکیسویں صدی میں'' کے ساتھ ''مغربی بنگال میں اردو صحافت'' اور ''ہندستان میں اردو کی صورت حال'' بہت پسند آئے۔

''جدید سیاسی فکر'' کے تبصرہ نگار نے اس کتاب کا مصنف سید انوار الحق حقی صاحب کو لکھا ہے حالانکہ یہ کتاب ڈاکٹر سید انوار الحق حقی اور راقم السطور کی مشترکہ تصنیف ہے۔خود'' اردو دنیا'' کے اسی شمارے میں صفحہ 9 پر کونسل کی دیگر تین مطبوعات کے ساتھ اس کا اشتہار شائع ہوا ہے اور اس میں اس کتاب کے دونوں مصنفین کا نام درج ہے۔

■ **انوار انصاری، سابق سینئر آڈٹ آفیسر، اولڈ ایچ. بی. روڈ، اپوزٹ چونا بھٹہ، شانتی نگر، رانچی-1 (جھارکھنڈ)**

''ہماری بات'' کے تحت آپ نے پر درد اداریہ قلم بند کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ناگہانی آفات کے اس قہر کو روک پانا تو ممکن نہیں ہے لیکن انتباہی نظام کے ذریعے جان و مال کے نقصان کو ضرور کم کیا جاسکتا ہے۔ جی ڈی چندن صاحب کا یہ مشورہ کہ ہر اردو اکادمی اپنی ریاست کے اردو اخباروں کی فہرست سازی کو اپنی مستقل سرگرمیوں میں شامل کرلے تو اس سے بڑا فائدہ ہوگا، یہ ایک مثبت اور تعمیری قدم ہوگا۔

سید سلیمان اختر کا مضمون ''اردو اور ہندستانی فلمیں'' ایک عمدہ مضمون ہے۔ فلموں میں اردو کا استعمال ناموں سے لے کر منظر ناموں اور نغمات تک جا بجا دیکھا جاسکتا ہے مگر تعصب کی بنا پر ایسی فلموں کو ہندی فلم کا سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے، یہ المیہ نہیں تو کیا ہے؟ ''ڈیڑھ صدی کی ڈاک'' ایک عمدہ معلوماتی مضمون ہے جس کا بہترین ترجمہ جاوید اقبال نے کیا ہے۔ ''موبائل فون کے مفید و مضر اثرات'' بھی ایک گراں قدر اور مفید مضمون ہے۔ موبائل فون ان دنوں کثرت سے استعمال ہو رہا ہے لہٰذا اس کے مضر اثرات کے متعلق عام لوگوں کو علم ہونا چاہیے۔ بچوں کا گوشہ بھی اچھا اور سبق آموز ہے۔

■ **صبغت اللہ ندوی، ابوبکر پور، باگھی، ویشالی، بہار-844112**

ماہ جنوری کا شمارہ حرف بحرف پڑھا۔ تمام مضامین معلومات افزا اور لائق تحسین ہیں۔ نثار احمد فاروقی پر متعدد مضامین شامل کر کے آپ نے ان کی زندگی کا احاطہ کیا ہے مگر اب بھی بہت سے پہلو تشنہ ہیں۔ ویسے شمارے کے تمام ہی مضامین خوب ہیں۔ خاص طور پر ''ہفت افلاک سے آگے''، ''معیاری ابتدائی تعلیم اور اساتذہ''، ''پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ'' اور ''گوشۂ فروغ کتب'' کے بھی مضامین بہت پسند آئے۔ ''طلبہ کے لیے'' کالم کے مضامین وقت کی ضرورت کے پیش نظر بہت کم ہیں اس کے صفحات مزید بڑھانے کی ضرورت ہے۔ کتاب میلے کا انعقاد فروغ اردو کے لیے بہت ہی مثبت قدم ہے، ہماری تمنا اور عاجزانہ درخواست ہے کہ بہار کی سرزمین پر بھی کتاب میلے منعقد کیے جائیں۔

□□□

ہماری بات

ہندستانی مشترکہ کلچر کے فروغ میں اردو زبان کا اہم رول رہا ہے۔ یہ ہندستان کی واحد زبان ہے جس کے لکھنے اور پڑھنے والوں کا حلقہ اتنا وسیع ہے اور ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی غرض ہر مذہب کے پیروکار اس کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہیں۔ یہ زبان صحیح معنوں میں ہندستان کی رنگارنگ تہذیب اور کثرت میں وحدت کی بہترین نمائندگی کرتی ہے اور اس کا اعتراف ہر باشعور شخص کرتا ہے۔ گزشتہ دنوں قومی اردو کونسل کی طرف سے منعقدہ دہلی اردو کتاب میلے کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے ملک میں اتحاد اور بھائی چارے کے فروغ میں اردو کے تاریخی رول کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ملک کو متحد رکھنے اور اس کی بھرپور ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اردو کو پھلنے پھولنے کا بھرپور موقع ملے اور اسے فروغ دیا جائے کیوں کہ یہ ایسی زبان ہے جو ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کی ترجمان ہے اور اس سے پورے ملک میں باہمی میل جول، قومی ہم آہنگی، اور سیکولر فکر کو مضبوطی ملتی ہے۔ اردو ملک میں امن، خیرسگالی اور جذبۂ ایثار کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اردو کی اہمیت کے پیش نظر وزارت ترقی انسانی وسائل ترجیحی بنیاد پر کام کرتی ہے اور اس کے لیے وسائل فراہم کرنے میں کسی بھی طرح کی کمی نہیں کرتی۔ محترم مرکزی وزیر نے اس موقعے پر یہ یقین دہانی کرائی کہ ان کی وزارت ہمیشہ کی طرح آئندہ بھی اردو زبان اور تعلیم کے فروغ کے لیے ہر ممکن تعاون جاری رکھے گی۔

یہ امر اردو کے لیے فال نیک ہے کہ متحدہ ترقی پسند محاذ حکومت نے اپنے قیام کے فوراً بعد سے ہی اس زبان کی ترویج و ترقی پر سنجیدگی سے توجہ دی ہے۔ متحدہ ترقی پسند محاذ کے کم از کم مشترکہ پروگرام میں اقلیتوں کی فلاح و بہبود اور ان کی تعلیمی ترقی کے لیے تین باتیں کہی گئی تھیں۔

1. متحدہ ترقی پسند محاذ مرکزی یونیورسٹیوں سے اقلیتی تعلیمی اداروں کی براہِ راست وابستگی کے امکان کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیشن قائم کرے گا۔ کمیشن اگر ضروری سمجھے گا تو اس مقصد کے لیے آئینِ ہند میں ترمیم کی سفارش بھی پیش کرنے کا مجاز ہوگا۔

2. اقلیتی فرقوں میں جدید اور تکنیکی تعلیم کے فروغ پر متحدہ ترقی پسند محاذ خصوصیت سے دھیان دے گا اور اقلیتوں کے سماجی اور اقتصادی امپاورمنٹ کے لیے تعلیم اور روزگار میں رزرویشن سمیت ان کی فلاح و بہبود کو اہمیت دے گا۔

3. متحدہ ترقی پسند محاذ آئین کی دفعہ 345 اور 347 کے تحت اردو زبان کی حیثیت کو تسلیم کرنے اور اسے فروغ دینے کی کوشش کرے گا۔

8 ماہ سے بھی کم عرصے میں حکومت نے اس ضمن میں بے حد اہم پیش رفت کی ہے۔ جسٹس ایم ایس اے صدیقی کی سربراہی میں نیشنل کمیشن فار مائناریٹی ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ اس کمیشن کے ذریعے جہاں اقلیتی تعلیمی اداروں کو اپنے مسائل سے براہِ راست حکومت کو آگاہ کرانے اور انھیں حل کرنے میں مدد ملے گی وہیں مرکزی یونیورسٹیوں سے ان کے الحاق کے بعد انھیں پیش آنے والی دقتوں کا بھی خاتمہ ممکن ہو سکے گا۔ مرکزی یونیورسٹیوں سے الحاق کے ذریعے اقلیتی تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کرنے والے افراد کو روزگار حاصل کرنے میں آسانی ہوگی اور اس سے بغیر کسی اضافی خرچ کے اقلیتی طبقوں کے تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں کے ذریعے اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کا نشانہ حاصل کرنے میں بھی مدد ملے گی۔

حال ہی میں مالی سال 06-2005 کا بجٹ پیش کرتے ہوئے وزیر خزانہ پی چدمبرم نے اردو کی تدریس کے لیے مرکزی امداد کا اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو یوپی اور بہار میں بہت بڑی تعداد میں لوگوں کی مادری زبان ہے مگر اردو کی تدریس کے لیے وہاں بہت کم گنجائش ہے۔ اب پرائمری اور اپر پرائمری اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے مرکزی حکومت امداد دے گی مگر ایسے اسکولوں میں اساتذہ کی تقرری کے لیے کم از کم ایک چوتھائی بچوں کا تعلق اس زبان سے ہونا چاہیے۔ وزیر خزانہ نے سرو شکشا ابھیان اور کستوربا بالیکا ودیالیہ اسکیم کے تحت اقلیتوں پر مرکوز آبادی والے علاقوں میں ضلع اور بلاک سطح پر نئے اسکول کھولنے کا اعلان بھی کیا۔

اردو تعلیم کے فروغ پر مرکزی حکومت کی خصوصی توجہ اس بات کی علامت ہے کہ حکومت اردو کی ترویج و ترقی کے لیے سنجیدہ ہے اور اس کے لیے نہایت منصوبہ بند طریقے سے کام کررہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو داں طبقہ حکومت کی طرف سے دی جارہی مراعات کا خاطر خواہ فائدہ اٹھائے اور ان علاقوں کی نشان دہی کی جائے جہاں قابلِ لحاظ اردو آبادی رہتی ہے تاکہ وہاں پرائمری، اپر پرائمری اسکولوں میں اساتذہ کی تقرری ہو سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو آبادی والے علاقوں میں سرو شکشا ابھیان اور کستوربا بالیکا ودیالیہ اسکیم کے تحت نئے اسکول کھولے جاسکیں۔

اس ضمن میں اردو والوں کو یہ بھی ذہن نشیں رکھنا ہوگا کہ وہ محض اردو تعلیم و تدریس پر ہی اکتفا نہ کریں بلکہ عصری ضرورتوں کا بھی خیال رکھیں۔ آج گلوبلائزیشن کے دور میں وہی زبان زندہ رہ پائے گی جو بدلتے وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالے اور سائنس و ٹیکنالوجی کا ساتھ دے سکے۔

مہمان اداریہ

ترقی پسند تحریک

ترقی پسند تحریک اپنوں کی عدم توجہ اور غیروں کی نظریاتی مخالفت کی وجہ سے طویل مدت سے لاوارث لاش کی طرح سرد خانے میں پڑی ہے، اسے سرد خانے سے باہر نکالنے کے لیے مرکز میں سیاسی تبدیلی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سرکاری ادارے قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام انجمن ترقی پسند مصنفین کے اشتراک سے راجدھانی دہلی میں ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ ترقی پسند تحریک کو زندہ کرنے کے لیے سیمینار منعقد کرنا وقت کی اہم ضرورت تھی تاکہ ہندستانی عوام اپنے ماضی سے روشناس ہوں۔

1947 میں انسانی خون سے نہلائی آزادی حاصل کرنے کے بعد جب مشترکہ کلچر دم توڑ رہا تھا۔ ہندو اور مسلمان کے درمیان نفرت کی اونچی دیوار کھڑی تھی۔ مذہب کے نام پر لٹے کٹے انسان تاریک راہوں پر خواجہ خضر کو تلاش کر رہے تھے تو سرکردہ ادیبوں، شاعروں، فنکاروں، ڈرامہ نویسوں، اسٹیج ایکٹروں اور موسیقاروں نے ایک ایسی کلچرل تحریک شروع کی جس نے پورے ہندستان میں نفرت اور فرقہ وارانہ تشدد کے خلاف عوام کو بیدار کیا۔ اس تحریک کے بانیوں نے بھوک، غربت، استحصال اور ظلم کے خلاف عام ہندستانیوں کو منظم کیا۔ اس دور میں اس کلچرل تحریک سے جو لوگ وابستہ ہوئے انھوں نے پیٹ پر پتھر باندھ کر اور سنگین مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے ایک پوری نسل کی ذہن سازی کر کے فرقہ وارانہ بھائی چارے کو تقویت پہنچائی۔ کلچرل تحریک نے آزادی کے بعد کی سیاست کو ایک نیا موڑ دیا۔ یہ تحریک جس نے بعد میں ترقی پسند تحریک کا رُخ اختیار کیا، ایک نئے انقلاب کی علامت بن گئی۔ اگر یہ تحریک زندہ رہی ہوتی، سیاست نے تجارت کا رُخ اختیار نہ کیا ہوتا اور زر و اقتدار کی ہوس نے نظریات، اقدار اور اصولوں کا خون نہ کیا ہوتا تو فاشسٹ، فرقہ پرست اور استحصالی عناصر نے ہندستان کو یرغمال نہ بنایا ہوتا۔

سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل ارجن سنگھ نے موجودہ حالات کا صحیح تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ فرقہ پرست اور فاشسٹ قوتوں نے آج پھر سر اٹھایا ہے، ان قوتوں کو کمزور تصور کرنا ہماری بہت بڑی غلطی ہے۔ آج ملک کے سامنے فرقہ پرست اور فاشسٹ جماعتیں پھر سے چنوتی بن کر کھڑی ہیں۔ ان سے مقابلے کے لیے ہمیں اسی جذبے، جوش اور اصولوں کی ضرورت ہے جو کامریڈ سجاد ظہیر اور ترقی پسندوں میں موجود تھے۔ ارجن سنگھ نے ترقی پسندوں کے جذبے اور جوش کا ذکر کر کے ترقی پسند تحریک کے کلیدی رول کو اجاگر کیا لیکن کیا نئی نسل ترقی پسند تحریک کے اصولوں اور منزل سے واقف ہے؟ کیا موجودہ نسل کو معلوم ہے کہ سجاد ظہیر، سردار جعفری، کرشن چندر، اختر الایمان، راہی معصوم رضا، پروفیسر محمد حسن، فیض احمد فیض، مجاز، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، اور دوسرے ادیبوں، مفکروں اور شاعروں نے آزادی کے بعد کے تاریک دور میں انسانیت کی شمع کیسے روشن رکھی۔ کیا کسی بھی سیکولر سرکار اور سیکولر پارٹی نے ترقی پسند تحریک کی روشن تاریخ سے نئی نسل کے ذہنوں کو غسل صحت دینے کی کوشش کی۔ ایک وقت آیا کہ ترقی پسند تحریک کا نام لیوا بھی نظر نہیں آتا تھا۔ سیاست کاروبار، نجی ترقی اور جائز ناجائز طریقوں سے دولت کمانے کا ذریعہ بن گئی۔ اصولوں، جذبات اور اقدار پر چناوی سیاست چھا گئی۔ بھوک، بیماری اور غربت سے دبی چلتی پھرتی لاشوں پر رائے شماری کا سلسلہ شروع ہوا۔ اصولوں کو سینے سے لگانے والوں کو بے وقوفوں کی صف میں کھڑا کیا گیا۔ سردار جعفری جیسا نوجوان اپنے جنون کا پرچم لے کر ظلم اور ظالم سے ٹکرانے کے لیے موجود نہیں ہے۔ آج سردار جعفری نئی نسل کو یہ پیغام دینے کے لیے ہم میں نہیں ہے۔

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

شمشیر تو اٹھائی ہم نے، بھائی کو بھائی سے لڑانے کے لیے، مسجد اور مندر کا تنازعہ حل کرنے کے لیے، مذہبی علامتوں کو مٹانے کے لیے، انسانوں کا خون بہانے کے لیے، شمشیر اٹھائی ہم نے زندہ ضمیروں کو مارنے کے لیے، شمشیر کی نوک پر انسانیت کو فنا کرنے کے لیے۔ ایسے حالات میں آج جب سرکاری سطح پر انجمن ترقی پسند مصنفین کے اشتراک سے ترقی پسند تحریک کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو سیاسی دلالوں، نیم حکیم نا خواندہ لکھاڑیوں، موقع پرستوں اور نمائشی ترقی پسندوں سے دور رکھا جائے۔ چونکہ سرکار بھی ترقی پسند فکر اور سوچ کو تقویت پہنچانے میں سنجیدہ نظر آتی ہے اسے ترقی پسند تحریک اور سرکردہ ترقی پسند کارکنوں کی تاریخ قلم بند کرانے کا بندوبست کرنا چاہیے تاکہ نئی نسل کو ماضی میں ڈوب کر تنگ نظری اور فرسودہ خیالات کے خلاف لڑی گئی جنگ کے مقاصد کو سمجھنے کا موقع ملے۔ جب ترقی پسند تحریک عروج پر تھی تو اس میں ایسے بھی لوگ شامل ہوئے جنھوں نے وقت گذرنے کے ساتھ اس تحریک سے ہر نازک مرحلے پر وشواس گھات کیا۔ آج بھی اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ بے زمین، بے نظریہ، بے ضمیر اور وقتی مفادات کے لیے چولا بدلنے والے ترقی پسند ہونے کا بورڈ گردن میں ڈال کر اپنا چہرہ صاف کرنے کی کوشش کریں گے۔ حالات نے ایسی کروٹ لی ہے کہ اوما بھارتی جیسی خاتون بھی دعوا کرتی ہیں کہ وہ مہاتما گاندھی کے اصولوں کو مانتی ہیں۔

ترقی پسند سوچ آج بھی لوگوں کو متحد کر سکتی ہے کیونکہ جن خطرات نے اس سوچ کو بڑھاوا دیا تھا وہی خطرات آج ہندستان کے سیکولر معاشرے کو نگل رہے ہیں۔ یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ فرقہ پرست اور فاشسٹ قوتوں نے آج پھر سر اٹھایا ہے۔ اس طرح کے خطرات کی نشاندہی کرنا ضروری ہے، البتہ ان خطرات کا مقابلہ ان ہتھیاروں سے کیا جا سکتا ہے جن کا استعمال ترقی پسند تحریک نے کیا تھا۔ ان کو اپنا کر ہی نئے صحت مند معاشرے کی تعمیر کی جا سکتی ہے۔

(بشکریہ "قومی آواز" نئی دہلی، 8 رفروری 2005)

فیروز عالم

اے.کے. ہنگل سے گفتگو

جناب اے.کے. ہنگل فلم اور تھیٹر کی مشہور و معروف شخصیت ہیں۔ فلم "شعلے" میں امام صاحب کا یادگار کردار ادا کرنے والے ہنگل صاحب کی پیدائش 1916میں سیالکوٹ میں ہوئی۔ آپ اب تک 250 فلموں اور تقریباً 60ڈراموں میں کام کر چکے ہیں۔ ہنگل صاحب انڈین پیوپل تھیٹرایسو سی ایشن کے کل ہند صدر ہیں اور آج بھی فلم اور تھیٹر سے گہرے طور پر وابستہ ہیں۔ گذشتہ دنوں ہنگل صاحب کونسل کی طرف سے منعقدہ سمینار" ہندستانی مشترکہ کلچرکی تعمیر: سجاد ظہیر اور دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی خدمات" میں حصہ لینے دہلی آئے۔ اس موقعے پر ان سے ہوئی بات چیت کے اہم اقتباسات قارئین" اردو دنیا" کی نذر ہیں۔

سوال: آپ تھیٹر سے کیسے وابستہ ہوئے؟

جواب : مجھے گانے بجانے کا شوق شروع سے ہی تھا۔ پیشاور میں میرے والد صاحب نوکری کرتے تھے۔ چنانچہ میری میٹرک تک کی تعلیم وہیں ہوئی۔اور پیشاور کے فنکاروں سے دھیرے دھیرے میرے تعلقات قائم ہو گئے میں وہاں کی" ہارمونیکا کلب" میں شامل ہوگیا۔ وہاں مجھے بیگم اختر کے والد خاں صاحب عاشق علی خاں کے ساتھ ہارمونیم پر سنگت کرنے کا موقع ملا۔ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی۔ پھر میں تھیٹر کی طرف مائل ہوا اور اسٹیج کے علاوہ ریڈیو پر بھی ڈرامے پیش کرنے لگا۔ آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ 16اگست 1947 کو میں نے پاکستان ریڈیو سے" بیکس" کے عنوان سے ڈراما پیش کیا۔

سوال :آپ جب سنِ شعور کو پہنچے وہ زمانہ بے حد افراتفری اور آویزش کا تھا۔ ایک طرف ہندستان میں آزادی کی تحریک شباب پر تھی، دوسری طرف دنیا دوسری عالمی جنگ کے دہانے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس دور کے متعلق کچھ بتائیے؟

جواب : اس زمانے میں پورے ملک میں آزادی کی لہر چل رہی تھی۔ ہمارے یہاں کانگریس کی باگ ڈور سرحدی گاندھی خان عبد الغفار خاں کے ہاتھ میں تھی۔ اس زمانے میں لال کرتی پارٹی کی قیادت میں کسان اور مزدور بھی ملک کی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ میں بھی اس سے متاثر تھا۔ کچھ دنوں بعد میرے ہیڈ ماسٹر علامہ مشرقی نے" بیلچہ پارٹی" قائم کی تو میں اس کا سرگرم کارکن بن گیا۔ اس پارٹی کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ عدم تشدد اس کا بنیادی اصول تھا۔ سارا سرحدی علاقہ اس کے زیر اثر آ گیا۔ گاندھی جی اور سرحدی گاندھی کی گرفتاری کے بعد پیشاور میں عظیم الشان جلوس نکلا۔ میں بھی اسکول سے بھاگ کر اس میں شریک ہوا۔ کابلی دروازے سے باہر قصہ خوانی بازار میں انگریز افسر نے گڑھوالی رجمنٹ کو مظاہرین پر گولی چلانے کا حکم دیا لیکن سپاہیوں نے نہتے لوگوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ پھر برٹش آرمی بلائی گئی۔ بہت سے لوگ مارے گئے۔ میں کسی طرح بچ نکلا۔

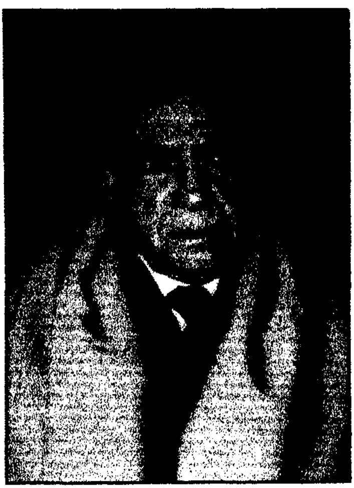

بھگت سنگھ کی پھانسی کے بعد پیشاور میں تعزیتی میٹنگ ہوئی جس میں ہزاروں سوگواروں نے شرکت کی، سارے لوگ رو رہے تھے۔ عبد الرب نشتر نے اس میٹنگ کی صدارت کی تھی۔

سوال : آپ اشتراکیت کی جانب کیسے مائل ہوئے؟

جواب : میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد والد صاحب نے سرکاری نوکری کرنے کے لیے کہا لیکن میں نے انگریزوں کی نوکری کرنے سے انکار کر دیا۔ انگریز افسر کی سفارش کے باوجود میں نے نوکری جوائن نہیں کی۔ میں نے ٹیلرنگ کا کام شروع کر دیا اور کچھ ہی دنوں

میں ایک ماہر Cutter بن گیا۔ والد صاحب کے ریٹائرمنٹ کے بعد میں کراچی آ گیا۔ کراچی میں نوکری کے دوران مجھے مالک اور مزدور کی کشمکش کا ذاتی تجربہ ہوا۔ اس سے میں اشتراکی نظریے کی طرف مائل ہوا۔ میں نے طبقاتی کشمکش اور اشتراکیت پر کتابیں پڑھیں اور دھیرے دھیرے ٹریڈ یونین لیڈر بن گیا۔ 1949 میں میں ہندستان آیا اور 1950 میں اپٹا جوائن کیا۔ ممبئی میں لگ بھگ تیس چالیس سال تک میں ٹیلرنگ کے پیشے سے وابستہ رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈرامے بھی چلتے رہے۔

سوال: سجاد ظہیر سے آپ کا بے حد قریبی تعلق رہا ہے۔ ان کے بارے میں ہمیں کچھ بتائیے؟

جواب: آزادی سے دو ایک مہینے پہلے کی بات ہے، مہاجرین کا آنا جانا جاری تھا۔ میں اس وقت ٹریڈ یونینوں میں کام کرتا تھا اور کراچی میں پارٹی کا سکریٹری تھا۔ کامریڈ سجاد ظہیر کا نام تو میں نے سنا ہوا تھا لیکن کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سنا تھا بڑے اچھے کامریڈ اور شریف انسان ہیں۔ چھوٹے بڑے پارٹی ممبروں سے برابر کا سلوک کرتے ہیں، ان کی باتیں توجہ سے سنتے ہیں اور ان سے صلاح و مشورہ بھی کرتے ہیں۔ اور بڑی بات یہ کہ اچھے ادیب اور ثقافتی قائد ہیں۔ انھی خوبیوں کی وجہ سے غائبانہ طور سے میرا کھنچاؤ ان کی طرف ہو گیا اور ملنے کو جی چاہتا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد کامریڈ سجاد ظہیر پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم کرنے کے لیے کراچی آئے۔ میرے ہی گھر میں ٹھہرے۔ سونے سے پہلے میری کتابوں میں سے ڈھونڈ کر مارکسزم پر لکھی گئی کتابیں پڑھتے تھے۔ میں نے جب پوچھا کہ آپ دیر تک کیوں پڑھتے ہیں اور وہ بھی اتنی بھاری بھرکم مارکسزم کی کتابیں، تو جواب ملا ''سپنے اچھے آتے ہیں''۔ اب تو بنے بھائی کے انتقال کو بھی کافی عرصہ ہو گیا ہے لیکن وہ اب بھی یاد آتے ہیں۔ آج ان کی زیادہ ضرورت ہے، نہ صرف ثقافتی سرگرمیوں کے لیے بلکہ پارٹی کے لیے بھی۔

سوال: فلموں میں آپ کو کیسے کام ملا؟

جواب: فلم والوں نے میرے ڈرامے دیکھے اور میرے کام کو پسند کیا۔ ''شاگرد'' میری پہلی فلم تھی جس میں میں نے سائرہ بانو کے باپ کا کردار نبھایا۔ ''گڈی'' میں ایکٹر کے طور پر میری شناخت بنی اور مجھے کیریکٹر ایکٹر کے طور پر پسند کیا جانے لگا۔ میں نے تقریباً ڈھائی سو فلموں اور پچاس، ساٹھ ڈراموں میں کام کیا۔ ایک دو انگلش فلمیں بھی کیں۔ ''ماؤنٹ بیٹن دی لاسٹ وائسرائے'' میں سردار پٹیل کا اور ''ہری اوم'' میں حویلی کی دیکھ بھال کرنے والے ایک سو سال کے بوڑھے کا رول کیا۔

سوال: آپ کو اپنی کس فلم کا رول زیادہ پسند ہے؟

جواب: ''شعلے'' میں امام صاحب کا رول میرا یادگار رول ہے۔ اس کے علاوہ نمک حرام، ارجن، کورا کاغذ، باورچی، شرارت اور لگان کے رول بھی مجھے پسند ہیں۔

سوال: آج کل فلموں میں فحاشی عام ہے، اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: فحاشی اور عریانیت نتیجہ ہے کمرشیلائزیشن کا۔ آج پیسہ کمانے کے لیے لوگ کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار ہیں۔ فلم ہی نہیں ہر جگہ یہی حال ہے۔ آج کی فلموں میں جسم تو ہے لیکن روح نہیں ہے۔ آج کا ہیرو صرف Muscle کی نمائش کرتا ہے اور اکثر ہیروئنیں بدن کی نمائش پر زیادہ زور دیتی ہیں، اداکاری پر کم۔ اس کے لیے ہمارا معاشرہ بھی بہت حد تک ذمے دار ہے۔ لوگ ایسی فلموں کو دیکھنا بند کر دیں تو فحاشی اور عریانیت خود بخود کم ہو جائے گی۔

سوال: موجودہ دور میں جب ہر جگہ ٹیلی ویژن اور فلم کا بول بالا ہے، کیا اس صورتِ حال میں تھیٹر کا وجود خطرے میں نہیں ہے؟

جواب: تھیٹر اور نوٹنکیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ فلم اور ٹی۔ وی سے ان کی مقبولیت میں کچھ کمی ضرور آئی ہے لیکن سماج میں ان کی جڑیں بہت گہری ہیں اور یہ کبھی ختم نہیں ہوں گی۔

سوال: آپ کے سپنوں کا ہندستان کیسا ہونا چاہیے؟

جواب: میں ایک ایسے سماج کا آرزومند ہوں جس میں ظلم، استحصال، بد عنوانی اور ذات پات کا بھید بھاؤ نہ ہو، ہر طرف معاشی آسودگی ہو سب کو اظہار رائے کی آزادی ہو، تمام لوگوں کو روٹی، کپڑا اور مکان ملے۔ مذہبی آزادی ہو لیکن اسے سیاسی مفاد کے لیے استعمال کرنے کی آزادی نہ ہو۔

سوال: ''اردو دنیا'' کے قارئین کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: عام فہم اردو لکھیے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیجیے۔ ہندی فلمیں جنوبی ہند میں بھی مقبول ہیں کیونکہ ان کی زبان بے حد آسان ہے۔

□□□

غلام نبی مومن

نصابِ تعلیم اور قومی یک جہتی

ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ نے فرمایا ہے "بچے جنت کا پھول ہیں۔" نوبل انعام یافتہ ہندستانی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا تھا کہ دنیا میں ہر آنے والا بچہ یہ پیغام لے کر آتا ہے کہ خدا ابھی اپنی مخلوق سے مایوس نہیں ہوا ہے۔ بچے ہماری خواہشات، آرزوؤں اور توقعات کا مرکز ہوتے ہیں۔ بچوں کا روشن مستقبل ملک کی ترقی و خوشحالی کا ضامن ہوتا ہے۔ اس لیے ہر قوم بچوں کو قدرت کا انمول تحفہ اور قیمتی سرمایہ سمجھتی ہے اور ان کی پرورش و نگہداشت نیز ان کی شخصیت کی تشکیل اور کردار سازی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتی۔ اس مقصد کے حصول میں تعلیم بنیادی رول ادا کرتی ہے۔ اس لیے ترقی کی خواہش مند ہر قوم اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر زیادہ سے زیادہ توجہ دیتی ہے اور ملک کے تعلیمی نظام کو بہتر سے بہتر بنانا ضروری سمجھتی ہے۔

آج تعلیم کے مفہوم و مقاصد میں کافی وسعت پیدا ہو چکی ہے۔ تعلیم کا اہم ترین مقصد بچوں کی فطری جبلتوں اور صلاحیتوں کو جلا بخشنا ہے۔ تعلیم ایک جانب فرد کو اپنے ملک کا ذمے دار اور قابل شہری بناتی ہے تو دوسری جانب اسے کسی مخصوص پیشے کے لیے درکار مطلوبہ معیار کی صلاحیت کارکردگی مہیا کرتی ہے۔ تعلیم ہی کی بنا پر سماج کو ڈاکٹر، انجینئر، اساتذہ، ماہر کاریگر اور سماجی خدمت گار فراہم ہوتے ہیں۔ تعلیم فرد کی شخصیت کی تکمیل کرتی ہے، اسے جلا دیتی ہے۔ یہی افراد مل کر معاشرہ بناتے ہیں اسی لیے فرد کی ترقی کو ملک و معاشرے کی ترقی کا اشاریہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے تعلیم کو فرد اور سماج دونوں سطحوں پر ترقی کا موثر وسیلہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

تعلیم ایک مسلسل عمل ہے جو صرف اسکول کی چار دیواری تک محدود نہیں رہتا بلکہ بچے کے اسکول میں داخلہ لینے سے قبل اور اسکول چھوڑنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اسکول میں دی جانے والی تعلیم منصوبہ بند ہوتی ہے جس کے تین بنیادی اجزا ہیں۔ پہلا جز و طالب علم ہے جس کی مخفی صلاحیتوں کو تعلیم کے ذریعے اجاگر کیا جاتا ہے، اس کی شخصیت کی تعمیر و ترقی کی کوشش کی جاتی ہے۔ دوسرا جز و معلم ہے، صحیح تعلیم دینا جس کی ذمے داری ہے۔ معلم بچوں کو صحیح راستے پر چلنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اکتسابی تجربات کے حصول میں ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ تیسرا جز نفسِ تعلیم ہے یعنی تعلیمی عمل کا دائرۂ کار جسے نصابِ تعلیم کہا جاتا ہے۔ تعلیم کی بنیاد نصاب ہی ہے اور یہی تعلیم کو صحیح سمت اور جہت عطا کرتا ہے۔ اس لیے نصاب سازی بہت پیچیدہ عمل ہے اور دقتِ نظر، تجربے اور مہارت کا متقاضی ہے۔ بچوں میں اچھائیوں کو فروغ دینا، برائیوں سے روکنا اور ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو نمو دینا نصاب کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ نصاب سازی میں ملک کی ضرورتوں، تقاضوں اور درپیش مسائل کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

دنیا میں تبدیلیوں کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے اور ان تبدیلیوں کے زیر اثر علم میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ تغیر و تبدیلی سے بھی دو چار ہوتا ہے۔ مثلاً طب، انجینئرنگ، سائنس وغیرہ میں نئے نئے تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ بعض پرانے نظریات فرسودہ قرار پاتے ہیں۔ بعض ایجادات از کار رفتہ قرار پاتی ہیں اور ان کی جگہ نئی ایجادات لے لیتی ہیں۔ ان تمام تبدیلیوں کو نصاب میں جگہ دینا بہت ضروری ہوتا ہے ورنہ نصاب عصری ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کرنے میں بری طرح ناکام ہو جائے گا۔ سماج کو نت نئے مسائل سے بھی جوجھنا پڑتا ہے۔ اُس کا پرتو بھی نصاب میں نظر آنا چاہیے۔ مثلاً مہاراشٹر میں لاتور میں زبردست زلزلہ آیا۔ بے پناہ جانی و مالی نقصان ہوا۔ حکومتِ مہاراشٹر نے ایک سرکلر کے ذریعے نصاب میں زلزلے کی ابتدائی معلومات شامل کرنے کی ہدایت دی۔ سونامی لہروں کی قیامت خیزی نے پوری دنیا کو ہلا دیا جس کی وجہ سے قدرتی آفات کے نقصانات سے بچنے کی تدابیر سے آگہی کا زبردست احساس پیدا ہوا اور Disaster Management ایک اہم ترین موضوع بن گیا ہے۔ حال ہی میں حکومتِ مہاراشٹر نے اعلان کیا ہے کہ آئندہ تعلیمی سال سے جماعت نہم اور دہم کے نصاب میں اس موضوع کو شامل کیا جائے گا۔

محض معلومات کی فراہمی سے ہی تدریسی عمل کی تکمیل نہیں ہو پاتی بلکہ تدریسی سرگرمیوں کے ذریعے بچوں کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں، بزرگوں اور سماج کے دیگر افراد کے ساتھ کس طرح پیش آئیں، اپنے اردگرد ہونے والے واقعات کا کس طرح تجزیہ کریں اور اپنے تجزیے کے نتائج کس طرح اخذ کریں۔ اپنے جذبات، خیالات اور فطری صلاحیتوں کا اظہار کس طرح کریں۔ اسی وجہ سے نصاب کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

"اسکول کے ذریعے، اسکول کے اندر اور باہر کی جانے والی سرگرمیوں کے ذریعے بچوں کے کردار و عمل میں مناسب و متوقع تبدیلیاں پیدا کرنے کی مجموعی کوششوں کا نام نصاب ہے۔"

آزادی کے بعد ایک ایسے نظامِ تعلیم کی ضرورت محسوس کی گئی جو ایک آزاد ملک کی ضروریات کو پورا کرے اور جس سے ملک کو درپیش مسائل کو حل کرنے میں مدد مل سکے۔ اس لیے 1952 میں سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن تشکیل کی گئی۔ اس کمیشن نے نصاب کی تعریف یوں بیان کی ہے:

"نصاب سے مراد محض مضامین نہیں ہیں جو اسکول میں روایتی طور پر پڑھائے جاتے ہیں بلکہ اس میں وہ سارے تجربات شامل ہیں جو اسکول میں بچے کو حاصل ہوتے ہیں۔ اسکول کی پوری زندگی نصاب ہے جو بچے کی زندگی کو

ہر پہلو سے مَس کرتی ہے اور اس کی متوازن شخصیت کی تعمیر میں مدد دیتی ہے۔''

سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن کے بعد کوٹھاری کمیشن کی تشکیل عمل میں آئی جس نے قومی مقاصد کو نصاب سازی کی بنیاد بنانے پر زور دیا۔ کوٹھاری کمیشن نے قومی صورتِ حال، ہندستانی آئین میں دی گئی ضمانتوں، ملک کی قدیم روایات اور اقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے درج ذیل مقاصد کو قومی مقاصد قرار دیا ہے:

(1) فرد کی پیداواری صلاحیتوں میں اضافہ کرنا

(2) جمہوری طرزِ حیات کے عقیدے کو پختہ کرنا

(3) سماجی و قومی یک جہتی کو فروغ دینا

(4) جدّت پسندی کو فروغ دینا

(5) سماجی، اخلاقی اور روحانی اقدار کی نشوونما اور کردار سازی

آزادی کے بعد ہندستانی عوام نے دستورِ ہند کے ذریعے بھارت کو ایک مقتدر، اشتراکی، غیر مذہبی، عوامی جمہوریہ بنانے کا عہد کیا ہے۔ مذہب، ذات پات، رنگ و نسل کے امتیازات کو ختم کرنا اور غیر طبقاتی سماج کی تشکیل کرنا دستور کی بنیادی قدریں ہیں، اس لیے سماجی و معاشی مساوات قائم کرنا ضروری ہے۔ ہندستان میں مختلف مذاہب، ذات پات، نسلوں اور طبقوں کے لوگ آباد ہیں۔ ہر ایک کی تہذیب و تمدن، رسم و رواج، زبان جداگانہ ہے۔ ان سب کو اس طرح فروغ دینا چاہیے کہ ملک میں انتشار کی کیفیت پیدا نہ ہو جائے بلکہ کثرت میں وحدت پیدا ہو، اسی وقت قومی یکجہتی قائم کرنے کا اہم مقصد پورا ہو سکے گا۔

لیکن افسوس آزادی کے بعد باشندگانِ ملک کے درمیان نفاق پیدا کرنے والی مختلف طاقتوں جیسے فرقہ پرستی، علاقہ پرستی، لسانی عصبیت، ذات پات کا بھید بھاؤ وغیرہ نے ہندستانی سماج کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔ ان طاقتوں نے اتحاد و یکجہتی کو پارہ پارہ کر دیا، نفرت اور نا اتفاقی کی دیواریں کھڑی کر دیں۔ ہندستان کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب جب ہم متحد رہے کسی بیرونی طاقت کی ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی لیکن جب بھی ہمارا اتحاد کمزور ہوا ہم غلام بنا لیے گئے۔ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی اپنا کر ہی تو انگریز اتنے برسوں تک ہمارے ملک پر حکومت کرتے رہے۔ اس لیے یکجہتی کو فروغ دینے کی شعوری کوشش کرنا اور نفاق پیدا کرنے والی طاقتوں کو شکست دینا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ تعلیم ہی وہ موثر وسیلہ ہے جس کے ذریعے اتحاد و یکجہتی کی منزل تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اسی لیے نئی نسل کو صحیح تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنا لازمی ہے۔ اس بات کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ انسان بچپن میں جو کچھ سیکھتا ہے اس کے نقوش تمام عمر اس کے ذہن میں محفوظ رہتے ہیں۔ یونیسکو کی جنوری 2000 کی قرارداد میں بھی اس حقیقت کا اعتراف موجود ہے:

''بچپن ہی سے بچوں کو دوسروں سے متعارف کرانا چاہیے اور صبر و تحمل، رواداری، عزت و احترام نیز دوسروں پر اعتماد کرنے کے اقدار سے روشناس کرانا چاہیے تاکہ دوسروں کے تئیں ان کے رویے، سلوک اور برتاؤ میں مثبت تبدیلی آئے۔''

مرکزی حکومت کے ساتھ ساتھ تعلیم کا انتظام کرنا ریاستوں کی بھی ذمّے داری ہے۔ اس لیے ریاستیں بھی اس سلسلے میں کوششیں کرتی رہتی ہیں۔ حکومتِ مہاراشٹر نے 1978 میں پرانے نصاب کو قومی مقاصد سے ہم آہنگ کرنے کے لیے جو نصابی کمیٹی نامزد کی تھی اس نے ابتدائی تعلیم کی کئی خصوصیات بیان کی ہیں۔ ان میں درج ذیل خصوصیات بھی شامل تھیں:

(1) سماجی و تہذیبی سرگرمیوں میں عملی طور پر شریک ہونے کے مواقع فراہم کر کے سماجی ذمّے داری کا شعور پیدا کرنا۔

(2) قومی و جذباتی یک جہتی اور قومی اندازِ فکر کو پروان چڑھا کر اخلاقی ذمّے داریوں کا شعور پیدا کرنا۔

(3) دوسرے ملکوں، ریاستوں اور مذاہب کے افراد کی زندگی اور تہذیب کے بارے میں ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنا اور ان کی خوبیوں کو اپنانے کی ترغیب دینا۔

1986 کی قومی تعلیمی پالیسی میں بھی تعلیم کے اس پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تہذیبی لحاظ سے متنوع ہندستانی سماج میں تعلیم کو ایسی عالمگیر اور دائمی اقدار کو فروغ دینا چاہیے جو تمام باشندوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی کو مستحکم کریں۔ مذکورہ پالیسی میں اس امر پر بھی زور دیا گیا ہے کہ اقدار پر مبنی تعلیم کے ذریعے ملک میں مذہبی تعصبات کو ختم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ جب تک ہم مذہب، علاقہ اور زبان کے محدود گلیارے سے نکل کر ملک کے تمام شہریوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام نہیں کریں گے، تب تک ہم میں یک جہتی پیدا نہیں ہوگی اور ملک کی ترقی، خوشحالی اور سالمیت ہمیشہ خطرے میں رہے گی۔ درحقیقت تعلیم کو عام کرنے کے مقصد ہی سے قومی تعلیمی پالیسی تیار کی گئی تھی جس کا بنیادی نصب العین قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو پروان چڑھانا ہی ہے۔

مختصر یہ کہ نصابِ تعلیم ہی وہ بنیاد ہے جس کے ذریعے قومی و تعلیمی مقاصد حاصل کیے جاتے ہیں اور اسی کے ذریعے نئی نسل کے ذہن و فکر کی نشوونما کی جاتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے تعلیم کو سیاسی مفادات کا آلۂ کار بنا لیا جاتا ہے۔

موجودہ مرکزی حکومت نے ازسرِ نو قومی نصاب کا خاکہ تیار کیا ہے اور ماہرین سے تجاویز اور مشورے طلب کیے ہیں۔ تعلیمی نظام سے جڑے ہوئے تمام افراد، ادارے، فلاحی انجمنوں اور ماہرینِ تعلیم کی ذمّے داری ہے کہ وہ اس نصاب کا باریک بینی سے جائزہ لیں، حکومت پر زور ڈالیں کہ نصابِ تعلیم میں گمراہ کن عناصر شامل نہ ہونے پائیں اور مستقبل میں جو بھی نصابِ تعلیم بنایا جائے اس میں صرف اور صرف ملک کی فلاح و بہبود، ترقی و خوشحالی اور یکجہتی کے مقاصد ہی شامل ہوں۔

Special Officer for Urdu, M.S. Bureau of Text Books,
Balbharati Senapati Bapat Marg, Pune-411004

□□□

عثمان شاہد

اردو تعلیم: کیفیت اور تدابیر

میں اگر کہوں کہ آزادی کے بعد ہماری تعلیم، ہمارے قومی مسائل حل کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی ہے تو غلط نہیں۔ پھر یہ بھی صحیح ہے کہ ملک کی اردو جیسی جمہوری زبان کو اس کا جائز حق نہیں دیا گیا۔ اسے مسلمانوں کی مذہبی زبان قرار دے کر اردو تعلیم کی راہوں میں گوناگوں دشواریاں پیدا کر دی گئی ہیں۔ ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ بچوں کی فطری صلاحیتوں کو ابھارنے اور پروان چڑھانے کے لیے انھیں مادری زبان کے ذریعے تعلیم دینا بے حد ضروری ہے۔ گاندھی جی اور رابندر ناتھ ٹیگور جیسے عظیم قومی رہنما بھی مادری زبان کے ذریعے بچوں کو تعلیم دینے پر زور دیتے رہے ہیں۔ یورپ کے تمام ملکوں اور ایشیا کے اکثر ملکوں میں بچوں کو پہلے درجے سے میٹرک تک ان کی مادری زبان ہی میں تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمارے ملک کا آئین بھی مادری زبان کے ذریعے تعلیم دینے کی اجازت دیتا ہے۔ سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو آبادی کے بچوں کو پہلی زبان کی حیثیت سے اردو پڑھانے کی گنجائش بھی ہے۔ اس کی دوسری شق میں بھی اردو کو ایک جدید ہندستانی زبان کے طور پر پڑھانے کا جواز موجود ہے مگر ان سب کے باوجود اردو تعلیم کی صورت حال بے حد خراب ہے۔

اردو زبان کا گہوارہ اور مشترکہ ثقافت کا مسکن کہلانے والے صوبے اتر پردیش میں دو کروڑ اردو بولنے والے موجود ہیں مگر یہاں بچوں کو اردو تعلیم سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس صوبے میں اردو کی جگہ انھیں ہندی پڑھائی جاتی ہے۔ پھر جدید ہندستانی زبان کی جگہ ایک قدیم غیر مستعمل زبان سنسکرت کو دے دی گئی ہے۔ یہاں کے چند میونسپل اسکولوں میں ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے بچے اردو پڑھتے ہیں اور دینی مدارس میں اردو کے ذریعے تعلیم کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس طرح اردو یہاں ایک محدود دائرے میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ نصف صدی کی مدت میں تین نسلیں اردو رسم خط سے بھی ناواقف ہو چکی ہیں۔

بہار میں ایک بڑی اردو آبادی کے باوجود اردو زبان اور اردو تعلیم کو یہاں کے دینی مدارس میں ہی پناہ مل سکی ہے۔ اردو اس صوبے کی دوسری سرکاری زبان ضرور ہے مگر یہاں بھی ہندی کا راج ہے اور اردو کی ترقی کے امکانات بہت روشن نہیں ہیں۔

مغربی بنگال میں مادری زبان کے ذریعے تعلیم دینے کی پالیسی پر عمل تو ضرور ہوتا ہے مگر اردو آبادی کے تناسب سے اردو اسکول نہ ہونے کے سبب اردو زبان اور اردو تعلیم کا امکان نظر نہیں آتا۔ تمل ناڈو میں ذولسانی فارمولے پر عمل ہوتا ہے جس کے تحت تمل اور انگریزی زبان کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے۔ اس لیے یہاں بھی اردو تعلیم کی سہولت نہیں ہے۔

آندھرا پردیش میں 1948 تک ابتدائی، ثانوی اور اعلا تعلیم اردو کے ذریعے دی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ سائنس، قانون، طب اور انجینئرنگ کی تعلیم بھی بڑی کامیابی کے ساتھ اردو کے ذریعے ہی دی جاتی تھی۔ حالات بدلے تو یہاں بھی اردو تعلیم کا برا حال ہوا۔ مگر اب جبکہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے اور آندھرا پردیش کے بعض علاقوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنا دیا گیا ہے تو امید ہے کہ مستقبل قریب میں اردو تعلیم کا دامن وسیع ہوگا اور اردو زبان یہاں پھر برگ و بار لانے لگے گی۔

کیرالا میں پچھلے تیس پینتیس برسوں سے اردو تعلیم میں دلچسپی لی جانے لگی ہے اور سرکاری اسکولوں میں اردو پڑھائی جا رہی ہے۔ تقریباً بیس فی صد دوسری زبانوں کے بچے بھی اردو پڑھنے لگے ہیں۔ یہاں توقع کی جا سکتی ہے کہ اردو ذریعۂ تعلیم کا سلسلہ بھی شروع ہو جائے گا۔

مہاراشٹر میں اردو کے لیے ماحول سازگار ہے۔ اردو آبادی کے علاقوں میں یہاں 2541 ابتدائی اور 698 ثانوی ایسے اسکول قائم ہیں جہاں بچے اردو کے ذریعے تعلیم پاتے ہیں۔ ایک خوش آئند بات یہ بھی ہے کہ اس صوبے میں اردو طلبہ کا معیارِ تعلیم دوسرے صوبوں کے طلبہ کے معیارِ تعلیم سے بہتر ہے۔

ریاست گوا میں پچھلے چند برسوں سے اردو ذریعۂ تعلیم میں بہتری آئی ہے۔ یہاں کے تمام ابتدائی اسکولوں اور پانچ ثانوی اسکولوں میں اردو تعلیم سے بڑی دلچسپی لی جانے لگی ہے۔ کرناٹک میں اردو تعلیم کی صورتِ حال ٹھیک ہے۔ جنوب کے اضلاع میں اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے جبکہ کرناٹک کے شمالی نو اضلاع میں اردو آبادی کے بچوں کو اردو کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے۔ 1932 میں سرسید احمد خاں کی تعلیمی پالیسی کے تحت کرناٹک کے شمالی اضلاع اور مہاراشٹر کے جنوبی اضلاع میں مسلمانوں نے تعلیم و تدریس کے خیال سے انجمنیں قائم کیں جن کے تحت اردو تعلیم کے ثانوی اسکول قائم کیے گئے جو آج بھی بہتر خدمت انجام دے رہے ہیں۔ حکومت کی نئی تعلیمی پالیسی کے تحت بھی اردو آبادی کے علاقوں میں ابتدائی اور ثانوی اسکول قائم کیے گئے اور اردو اساتذہ کی تعداد دگنی سے بھی زیادہ کر دی گئی۔ اس صوبے میں اردو اساتذہ کی تربیت کے لیے 42 اردو تربیتی کالج بھی قائم ہیں۔

ہمارے ملک میں اردو تعلیم کی تین شکلیں ہیں۔ کہیں یہ اسکولوں میں چھٹے درجے سے ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے تو کہیں پہلے

درجے سے میٹرک تک ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے اور کہیں پہلے درجے سے میٹرک تک یہ ذریعۂ تعلیم ہے۔

اردو زبان و ادب کی بقا اور ترویج کا انحصار تمام تر اس کی تعلیم پر ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اردو تعلیم کی راہ میں مختلف نوع کی رکاوٹیں پیدا کی جاتی رہی ہیں۔ جیسے کہیں آبادی کے تناسب سے مدرسوں کی کمی ہے تو کہیں اساتذہ کی کمی ہے۔ کہیں نصابی کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں تو کہیں دیر سے دستیاب ہوتی ہیں۔ پھر اردو اساتذہ کو علاقائی زبان میں تربیت دی جاتی ہے جس کے باعث تمام اساتذہ اس سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ اردو سے ناواقف افسران کا اردو اسکولوں پر تسلط بھی ایک قسم کی دشواری ہے مگر ان سب رکاوٹوں کو بڑی حد تک صبر و تحمل اور حکمتِ عملی کے ذریعے دور کیا جا سکتا ہے۔

یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ تعلیم امن و سلامتی کی امین، تہذیب و ثقافت کی ضامن اور معراج انسانیت کی نقیب ہے۔ اس کارِ عظیم کے متحمل صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ کے بندوں کے ہمدرد اور بہی خواہ ہوتے ہیں، جنھیں خدمت کا شوق بے چین رکھتا ہے۔ جن کے عزم محکم اور عملِ پیہم سے زندگی کی راہیں جگمگانے لگتی ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں معماران قوم کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اساتذہ کو چاہیے کہ پہلے خداترس انسان بنیں۔ حرف شکایت زبان پر نہ لائیں، اتحاد و اتفاق کو مقدم سمجھیں اور اس کے استحکام کی پوری کوشش کریں۔ اپنے طرزِ عمل سے ظاہر کریں کہ واقعی انھیں اس پیشے سے محبت ہے۔ محبت اور شفقت کو اپنا شعار بنالیں۔ غرور اور غصے کو دل سے دور رکھیں۔ مفلس اور نادار بچوں کو محرومی کا احساس ہونے نہ دیں۔ اسکول ایک سماجی ادارہ ہے۔ اس لیے اسے سماج سے کٹنے نہ دیں۔ وقت کی پابندی کریں اور طلبہ کو بھی پابند بنائیں۔ مدرسے میں علم و ادب کا ماحول بنائیں۔ علم دوست لوگوں سے میل جول رکھیں اور علم کا چرچا کرتے رہیں۔ صحیح اردو بولیں اور طلبہ میں اس کی رغبت پیدا کریں۔ مطالعے کو اپنی عادت بنائیں اور طلبہ کو بھی اس کا عادی بنائیں۔ اخبارات و رسائل خرید کر پڑھیں اور دوسروں کو بھی تلقین کریں۔ تعلیم ایک مسلسل چلتے رہنے والا عمل (Continous Process) ہے۔ لہٰذا اسے ہنگامی یا روایتی نہ بنائیں۔ تعلیم و تدریس کے جدید طریقوں اور تکنیک سے مکمل استفادہ کریں تاکہ طلبہ میں متوقع صلاحیتیں بیدار ہوں۔ خود احتسابی طریقے پر عمل کریں۔ اس سے ان کے جوہر کھلیں گے اور تدریس موثر ہوگی۔ تعلیم کا خاص مقصد بچوں کو محض امتحان دینے کے قابل بنانا نہیں ہے بلکہ ملک کے لیے بہترین شہری تیار کرنا ہے۔ اس اہم مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے تعلیم دیں۔

"Urdu Ghar", Belgaum Road, Dharwar-8

□□□

بہادری کے کارنامے

مصنف: منوج داس/ مترجم: ایس. ایم. احمد

ہمارے ملک کو انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے لاتعداد قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ جن سورماؤں نے اپنی جان آزادی وطن کے لیے نچھاور کی، ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ زیر نظر کتاب میں جدوجہد آزادی کے ابتدائی دور کے ایسے ہی بہادر سپوتوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت: -/25 روپے

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب: ڈاکٹر وشوامتر اپادھیائے/ مترجم: احسان احمد صدیقی

مادرِ وطن کی آزادی کے لیے اپنی جان کی قربانی پیش کرنے والوں میں مشہور انقلابی رام پرشاد بسمل سر فہرست ہیں۔ یہ آپ بیتی انھوں نے گورکھپور جیل میں اپنی پھانسی سے دو دن پہلے مکمل کی تھی۔ جدوجہد آزادی کے اس دور کی حقیقی تصویر کشی کے سبب یہ آپ بیتی دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 109، قیمت -/33 روپے

سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں

مصنف: راجندر راو سکھی/ مترجم: عبدالغفار خاں

خان عبدالغفار خاں کی زندگی طوفانوں کی تاریخ ہے۔ ہندستان کی جنگِ آزادی سے لے کر پاکستان کے قیام کے بعد تک وہ پختونوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف غریبوں اور مظلوموں کی لڑائی لڑتے رہے اور اس لڑائی میں ان کی زندگی کا بیشتر حصہ جیل میں گزرا۔ سرحدی گاندھی کے حالات زندگی سے واقفیت کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کریں۔

صفحات: 78، قیمت: -/21 روپے

تین زنگ نورگے

مصنف: درگا پرشاد شکل/ مترجم: جہاں آرا

تین زنگ نورگے اور ایڈمنڈ ہلیری کوہ پیمائی کی تاریخ کے روشن باب ہیں۔ زیر نظر کتاب میں تین زنگ نورگے کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ ایورسٹ کی چوٹی سر کرنے کی مہم کی پوری تفصیل درج ہے۔

طلبہ کے لیے ایک بے حد معلوماتی کتاب۔

صفحات: 87، قیمت: -/21 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے%40کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم نئی دہلی

عبدالعلیم قدوائی

مولانا عبدالماجد دریابادی کی صحافتی خدمات

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم (1977-1892) مفسرِ قرآن اور صاحب طرز انشا پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے ایک باکمال صحافی بھی تھے۔ چنانچہ اردو صحافت میں ان کے ہفتہ وار اخبارات ''سچ''، ''صدق'' اور ''صدق جدید'' کا شمار وقیع اور معتبر جریدوں میں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے 1925 میں صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور اپنا ہفتہ وار اخبار ''سچ'' کے نام سے نکالا جو اپنے نام اور مفید مشمولات کی وجہ سے جلد ہی بہت مقبول ہوگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں مولانا ابوالکلام آزاد ''الہلال''، مولانا محمد علی ''ہمدرد'' اور مولانا ظفر علی خاں ''زمیندار'' کے ذریعے، صحافت کے میدان میں اپنی دھاک جما چکے تھے مگر اس کے باوجود مولانا نے اپنے منفرد اسلوب بیان اور معنی آفرینی سے اپنی جگہ ان سب سے الگ اور ممتاز بنالی اور اپنی صحافت کا لوہا منوالیا۔ مولانا نے ''سچ'' کو کسی دنیوی منفعت وتجارت کے خیال سے نہیں نکالا۔ وہ صحافت کو خدمت خلق کا ذریعہ سمجھتے تھے اور ان کا یہ تاثر آخر دم تک قائم رہا۔ ''سچ'' 1925 سے 1933 تک نکلتا رہا، اس کے بعد ''صدق'' 1935 سے 1950 تک نکلتا رہا اور دسمبر 1950 سے ''صدق جدید'' ان کی وفات 1977 تک شائع ہوتا رہا بلکہ ان کے بعد بھی ان کے لائق جانشیں اور بھتیجے حکیم عبدالقوی اسے 1985 تک نکالتے رہے۔ ان اخباروں کے ذریعے مولانا نے ملک وملت کی بڑی خدمات انجام دیں۔ بہت سے فکری اور قلمی معرکے کامیابی سے سر کیے۔ مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے تہذیب نو کی بے وقعتی، جھوٹی چمک دمک اور ان کی مضرتوں اور خرابیوں کا پردہ فاش کیا اور اسی کے ساتھ ہی اردو صحافت کے لیے کچھ رہبر اصول وضع کیے جنھیں انھوں نے بڑے سلیقے سے اپنی 51 سالہ صحافتی زندگی میں برت کر دکھا دیا۔

مولانا کو لکھنے پڑھنے کا شروع ہی سے شوق تھا چنانچہ نو سال کی عمر میں ان کا پہلا مضمون روزنامہ ''وکیل'' امرتسر میں شائع ہوا۔ دوران طالب علمی اور تعلیم کے بعد بھی ان کے علمی، ادبی اور مذہبی مضامین اور ترجمے ''الندوہ''، ''الناظر''، ''مشرق''، ''صبح امید''، ''العصر''، ''ہمدم''، ''حقیقت''، ''معارف''، ''ہمدرد''، ''ہندستانی'' وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ انھوں نے حقیقت، ہمدرد اور معارف کی نگرانی کا کام بھی کچھ عرصے تک انجام دیا۔

جنوری 1925 میں انھوں نے لکھنؤ سے اپنا پہلا ہفتہ وار ''سچ'' نکالنا شروع کیا جس میں ہندو مسلم اتحاد، قومی تحریکات سے ہمدردی بالخصوص تحریک خلافت، ترک موالات، ردِ بدعات، اصلاح معاشرہ پر مضامین کے علاوہ مختلف ملی و ادبی فتنوں کا موثر اور مدلل جواب دیا جاتا تھا۔ نیز تہذیب مغرب کے مفاسد و مضرتوں کا پردہ چاک کیا جاتا تھا۔ چونکہ وہ خود دانش حاضر کے عذاب سے گزرے تھے اس لیے وہ مستشرقین کی فتنہ پردازی اور مذہبی و ادبی اور اخلاقی تجاوزات اور تسامحات کا پورا نوٹس لیتے اور ان کے خلاف لکھنا اپنا فرض عین سمجھتے تھے۔ ان کا یہی رویہ ''صدق'' اور ''صدق جدید'' میں بھی رہا بلکہ تقسیم ملک کے بعد جو افسوسناک حالات اردو اور مسلم اقلیت کے لیے پیدا ہوئے ان کا مقابلہ انھوں نے بڑی پامردی سے کیا اور اپنی صحافتی زندگی میں چوکھی لڑائی لڑی۔ حق گوئی اور بے باکی ان کا ہمیشہ شعار رہا اس لیے ان کا احترام سرکاری حلقے اور مخالفین بھی کرتے تھے۔

ان اخبارات کے مصلحانہ کارناموں کے علاوہ حسن انشا، معنویت اور معلومات کی فراوانی نے بھی ان کی مقبولیت اور درجۂ استناد میں قابل قدر اضافہ کیا۔ آج بھی ان کی علمی اور ادبی عظمت کا کھل کر اعتراف کیا جاتا ہے۔ مولانا مرحوم کو زبان کی صحت، لکھنؤ کے روزمرہ اور صنائع و بدائع کے حسن استعمال کا خاص خیال رہتا تھا چنانچہ وہ زبان اور ترکیبوں کی غلطیوں پر اپنے معاصرین کو ٹوکتے رہتے اور لغت و زبان کی تحقیق برابر کرتے تھے۔ ان اخباروں کی ترتیب بھی وہ خاص ڈھنگ سے کرتے تھے۔ پہلے صفحے پر ان کے قلم سے ''سچی باتیں'' ہوتی تھیں جس میں حکمت و موعظت کے موتی مختلف مذہبی ادبی، سماجی، تاریخی، سیاسی اخلاقی عنوانات کے تحت بکھرے ہوتے تھے جس سے پڑھنے والے نہایت متاثر ہوتے تھے۔ یہ کالم ہندستان اور پاکستان کے متعدد اخبارات اور رسائل میں کثرت سے نقل ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی سطح پر ہونے والے واقعات کے متعلق شذرات لکھتے تھے جن میں ان واقعات پر اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں تبصرہ ہوتا تھا اور اخلاقی نتائج نکالے جاتے تھے۔ ان کی سرخیاں بڑی دلچسپ، برجستہ اور موثر ہوتی تھیں جن کے لیے وہ مناسب اشعار، مصرعے، ضرب الامثال اور محاورے بڑے سلیقے سے استعمال کرتے تھے۔ ان کی تحریروں میں بلا کی چاشنی و شگفتگی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ تفسیر قرآن، علمی و ادبی موضوعات پر مقالات، ریڈیو کے نشریے، کتابوں اور رسالوں پر تبصرے اور مشورے اور گزارشیں اور مراسلات بھی شائع ہوتے تھے جن کو بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔

اردو صحافت پر ان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے اس کے کچھ رہنما اصول وضع کیے اور ان پر بڑے سلیقے سے عمل کیا۔ اپنے تجربے کی روشنی میں انھوں نے صحافت کے حسب ذیل مقاصد اور آداب مقرر کیے۔

1. صحافت کا مقصد خدمت دین وملت ہے۔ عام خدمت خلق بھی اسی کے ذیل میں آجاتی ہے۔ اس طرح صحافت ایک قسم کی عبادت ہے نہ کہ دنیوی نفع حاصل کرنے کا ذریعہ یا تجارت۔

2. عوامی جذبات کی محض نمائندگی کافی نہیں۔ ان کے مذاق، جذبات اور شعور کی اصلاح کرنا، ان کو بلند اور پاکیزہ بنانا زیادہ ضروری ہے۔

3. وطن کا بڑا حق ہوتا ہے اس لیے ملک کی اکثریت کا، اپنے ہم وطنوں کے جذبات و احساسات اور حکومت وقت کے قانون کا احترام لازم ہے۔ سلامت روی، اعتدال اور ہوش مندی کی راہ اختیار کرنا چاہیے لیکن مرعوبیت، احساس کمتری، بزدلی اور خوشامد کے قریب نہ پھٹکنا چاہیے۔

4. دوسروں کا احتساب ہر عوامی معاملے میں ضرور کیجیے لیکن اپنے کو احتساب سے بالا نہ سمجھیے۔

5. بغیر کسی معقول وجہ کے کسی کی دل شکنی یا دل آزاری گوارا نہ کیجیے۔ مروت کے حدود قائم کیجیے اور ان کا خیال رکھیے۔

6. تنقید آزادی سے کیجیے مگر اس کی بنیاد ذاتی یا شخصی تعریضات، نسب، وطن، شکل صورت، عادات، پیشہ وغیرہ پر طنز و استہزا پر ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ نظر ہمیشہ ما قال پر نہ کہ من قال پر رکھیے۔

7. خیال کیجیے اور ڈرتے رہیے، اس وقت سے جب آپ کا سارا دفتر آپ کے سامنے ہوگا اور آخری و حقیقی عدالت میں آپ کے لکھے ایک ایک لفظ پر سوال ہو رہا ہوگا۔

8. زبان، لغت، محاورہ اور روزمرہ کی صحت کا خاص خیال رکھیے۔ سنسنی خیز خبروں اور افواہوں کی اشاعت سے بچیے۔ مقصود علم و ادب، مذہب و اخلاق کا ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے۔

درج بالا اصولوں کی پابندی کی وجہ سے مولانا مرحوم کے اخبارات بہت مقبول ہوئے اور انھیں اردو صحافت کے محسنین کی صف اول میں مقام حاصل ہوا۔

Deptt. of English,
A.M.U., Aligarh (U.P.)

□□□

گاندھی کی کہانی

مصنف: راجکماری شنکر/مترجم: نامی انصاری

اس کتاب میں بابائے قوم کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ ہندستان کی جنگ آزادی کی تاریخ بھی عام فہم زبان میں درج کی گئی ہے۔ گاندھی جی اور ان سے متعلق دیگر افراد کی تصویریں بھی کتاب میں موجود ہیں۔

صفحات: 120، قیمت: -/35 روپے

بچوں کے نہرو

ایم. چالاپاتھی راؤ/مترجم: نامی انصاری

پنڈت جواہر لال نہرو بچوں کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور اس لیے بچے انھیں چاچا نہرو کہتے تھے۔ اس کتاب میں جدید ہندستان کے اس معمار کی حیات اور شخصیت کے تمام گوشوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 112، قیمت: -/32 روپے

اندرا پریہ درشنی

مصنفہ: الکا شنکر/مترجم: شفیق مظفر پوری

اس کتاب میں تقریباً تین دہائیوں تک ہندستانی سیاست پر چھائی رہنے والی اندرا گاندھی کی شخصیت اور زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 142، قیمت: 45 روپے

شنکر

مصنفہ: الکا شنکر/مترجم: انیس اعظمی

ملک کے مایۂ ناز کارٹونسٹ کیشو شنکر پلّئی کی سوانح، جو دلچسپ بھی ہے اور حوصلہ بخشنے والی بھی۔

صفحات: 128، قیمت: -/35 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

نسیم عارفی

اردو صحافیوں کی تربیت کا مسئلہ

کسی بھی صنعت کی ترقی اس سے وابستہ افراد کی پیشہ ورانہ صلاحیت اور اہلیت کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ صحافت کا جائزہ بھی اسی نظریے سے لیا جانا چاہیے۔ کیونکہ اب صحافت بھی ایک صنعت بن گئی ہے۔ اس لیے صنعت اور پیشے کے متوازی ارتقا پر توجہ مرکوز کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ وہ دور ختم ہو گیا جب صحافت کو ایک مشن سمجھا جاتا تھا اور ایک مشترکہ مقصدِ حیات کے حصول کے لیے اس سے کام لیا جاتا تھا۔

لیکن اب مارکیٹ معیشت میں اس صنعت سے وہی افراد وابستہ ہو سکتے ہیں جو اشیا اور خدمات کے خریداروں اور فروخت کنندگان کی مارکیٹ پر یقین رکھتے ہیں۔ آج اس پس منظر میں ''اردو صحافت اور صحافیوں کی تربیت کے مسئلے'' کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ کسی اخبار کی اشاعت آج شوق اور تفریح کا سامان نہیں ہے۔ مختلف اور متضاد نظریات اور عقیدوں کے معاشرے کی کیا ضروریات ہو سکتی ہیں اور انھیں کس طرح دلچسپی کے ایک ڈور میں باندھا جا سکتا ہے، ایک اہم سوال ہے جس کا جواب تلاش کیے بغیر کروڑہا روپے کی سرمایہ کاری بے مقصد اور بے فیض ثابت ہو سکتی ہے۔

ہندستان میں جہاں اردو لکھنے، پڑھنے والوں کی تعداد آج لگ بھگ پانچ کروڑ ہے، اردو اخبارات کی طباعت و اشاعت کے کافی امکانات ہیں۔ ایسے صاحب ثروت اصحاب بھی ہیں جو بہ آسانی طباعت و اشاعت کی ذمے داری سنبھال بھی سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ سوچنا پڑتا ہے کہ تربیت یافتہ عملہ کہاں ملے گا؟ موجودہ اردو صحافت نے عصری ٹیکنالوجی سے استفادہ کرتے ہوئے اردو اخبارات کو کسی بھی دوسری زبان کے اخبارات کی پہلی صف میں بٹھا دیا ہے۔ اس طرح اس کاروبار میں دوسروں کے لیے بھی ایک طرح کی کشش پیدا کر دی ہے۔ لیکن دوسری طرف اردو صحافیوں کی تعلیم و تربیت پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ گذشتہ دنوں اسی موضوع پر گفتگو کے دوران صحافت سے وابستہ میرے دوست عمر فاروق نے مجھ سے یہ سوال پوچھا تھا کہ اردو صحافت کے کرتا دھرتا اصحاب نے اس پیشے کو کس حد تک پرکشش بنایا ہے؟ ان کا کہنا یہ بھی تھا کہ جب صورتِ حال مایوس کن ہو تو ہم اردو صحافت کی طرف نئی نسل کو کس طرح متوجہ کر سکیں گے۔ اس بات میں بڑی معقولیت ہے۔ لیکن اس مسئلے پر میرا تجربہ اور اندازِ فکر جداگانہ ہے۔ بھلے ہی اردو صحافت کو انگریزی اور دوسری علاقائی زبانوں کے اخبارات کی طرح شرائط ملازمت یا مشاہرے کے اعتبار سے پرکشش نہ بنایا گیا ہو لیکن تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے جس کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ آج جن اصحاب نے خود کو اس پیشے سے وابستہ کر رکھا ہے انھوں نے اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے لحاظ سے اس پیشے کو کس حد تک وقار بخشا ہے۔ آج خود ہم اپنی ریاست کے کسی ایسے اردو صحیفہ نگار کی نشاندہی کرنے کے موقف میں نہیں ہیں جس کا نام حیدرآباد کی چہار دیواری سے باہر سنا جا سکتا ہے۔ اسی طرح دوسری ریاستوں کے اردو صحیفہ نگاروں کا نام بھی حیدرآباد میں شرفِ قبولیت نہیں پا سکا، برخلاف اس کے انگریزی اخبارات کے صحیفہ نگار اپنے خلاق ذہن کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف ریاستی سرحدوں کو توڑتے ہیں بلکہ اپنے مخالف ملی مذہبی عصبیت پر بھی قابو پا لیتے ہیں اور ان کے ذہن پر چھا جاتے ہیں۔

یہ کہنا کہ اخبارات کے ایڈیٹر حضرات نے اپنے اخبار سے وابستہ کسی بھی صحیفہ نگار کو ایسا موقع ہی نہیں دیا کہ اس کا قد ایڈیٹر کے قد سے اونچا رہے، میرے خیال میں بے بنیاد بات ہے۔ میں نے 40-35 برسوں کے دوران کبھی یہ نہیں دیکھا کہ کسی اخبار کے ایڈیٹر نے اپنے اخبار کے کسی صحیفہ نگار کی صلاحیتوں کو دبانے کی کوشش کی ہو اور اس کے معقولیت پسند اندازِ فکر کے حامل مضامین کی اشاعت کو اس خوف سے روکا ہو کہ ان کی اشاعت سے معاشرے میں اس کا قد گھٹ جائے گا۔ میری طرح بہت سے احباب ایسے کئی صحیفہ نگاروں سے واقف ہیں جنھوں نے اپنے کیریئر کا آغاز تو اردو صحافت سے کیا تھا لیکن بعد میں انھوں نے اپنی محنت، لگن اور جستجو کے ساتھ انگریزی زبان کی صحافت کو اپنا لیا اور اپنی صلاحیتوں کے ذریعے قومی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی پہچان بنائی۔ اردو صحافت میں اگر حالات کو بہتر بنایا جاتا تو یقین تھا کہ یہ صلاحیتیں بھی جو آج انگریزی صحافت سے وابستہ ہیں اردو صحافت کا ایک ورثہ رہتیں۔

ہمیں اس بات کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ پیشۂ صحافت کو باوقار بنانے میں صحیفہ نگاروں کا بھی اپنا رول ہے۔ وہ آنے والی نسل کے لیے آئیڈیل بن سکتے ہیں بشرطیکہ وہ عام سطح سے ذرا بلند ہو کر اپنی ذہانت، عقل، فہم و فراست، معقولیت پسندی، جدت پسندی، روشن خیالی اور غیر جانبداری کا مظاہرہ کریں۔ لیکن اردو صحیفہ نگاروں نے اس طرح کی سنجیدہ باتوں پر بہت کم توجہ دی ہے۔ ذوق و شوق اور خود کو وقف کر دینے کا جذبہ بھی تو دوسری باتوں کے مقابلے میں اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ اگر ان باتوں کا ادراک نہیں کیا جائے گا تو اردو قارئین کی ذہنی پسماندگی کے لیے ہم صحیفہ نگاروں پر بھی ذمے داری عائد ہوگی کیوں کہ ایک بالغ نظر معاشرے کے لیے صحیفہ نگار کی حیثیت بھی ایک معلم کی طرح ہوتی ہے۔

دو چار مرفع الحال اخبارات کو اپنے سامنے رکھ کر ہم ہندستان کی اردو صحافت سے یہ گلہ نہیں کر سکتے ہیں کہ اس نے پیشۂ صحافت کو نئی نسل کے لیے

پرکشش نہیں بنایا۔ کیونکہ تقریباً پوری اردو صحافت عملاً ایک بحران سے گزر رہی ہے نہ اسے حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اور نہ کارپوریٹ سیکٹر کی، جیسے کہ دیگر علاقائی زبانوں کے اخبارات کو حاصل ہے۔ وہ اتنی طاقت بھی نہیں رکھتی کہ کچھ دے سکے دراصل یہ اردو زبان کا ایک المیہ ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ مرفع الحال اخبارات کی کوتاہیوں کی پردہ پوشی کے لیے کوئی جواز پیدا کیا جائے...... ان اخبارات کو بھی بہر حال ایک مثال قائم کرنی چاہیے۔

جہاں تک اردو صحافیوں کی تربیت کا سوال ہے، حالیہ عرصے میں بعض یونیورسٹیوں نے جن میں حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی اور مولانا آزاد اردو یونیورسٹی بھی شامل ہیں، اردو صحافت کا نصاب رائج کیا ہے۔ یقین ہے کہ یہاں سے فارغ التحصیل طلبہ اردو اخبارات کے لیے اثاثہ بنیں گے۔ لیکن صحافت میں تعلیم و تربیت کا مسئلہ انڈا پہلے یا مرغی پہلے کی کہاوت کے مصداق ہے۔ یونیورسٹیاں نظریہ تو دے سکتی ہیں لیکن طلبہ کی تربیت نہیں کرسکتیں۔ تربیت کے لیے ثابت قدمی کے ساتھ اخبارات سے وابستہ ہونا پڑتا ہے۔ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل طلبہ میں اگر ذوق و شوق ہے اور قوت مشاہدہ ہے تو پھر وہ صبر و استقلال کے ساتھ اخبارات کے دفاتر میں اپنا راستہ آپ نکال سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلاس روم میں اساتذہ کو جو وقت دستیاب رہتا ہے وہ کسی اخبار کے نیوز روم میں کام کرنے والے جرنلسٹ کو دستیاب نہیں ہوسکتا۔ اسے مقررہ وقت پر اپنی کاپی بھیجنی پڑتی ہے۔ وہ اسی میں مصروف رہتا ہے۔ طلبہ کی تربیت کے لیے وقت نکالنا دشوار ہوجاتا ہے۔ اسی لیے کلاس روم اور نیوز روم میں جو فاصلہ ہے اسے دور کرنے کی ضرورت ہے تبھی ہم مستقبل کے صحیفہ نگاروں کی بہتر تربیت کو یقینی بنا سکتے ہیں۔

اردو صحافیوں کی تربیت کا مسئلہ اردو تعلیم سے بھی جڑا ہوا ہے۔ اس لیے آج اردو تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے پر توجہ مرکوز کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ جب تک ہم اردو تعلیم کے معیار کو بہتر نہیں بنائیں گے اس وقت تک اردو صحافت کے معیار کو بھی بلند نہیں کرسکتے۔ بیشتر قارئین املا اور انشا کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کی شکایت بجا ہے لیکن جہاں اخبارات میں 90 تا 95 فیصد اسٹاف پر غیر معیاری اردو تعلیم کا اثر ہے وہاں ان غلطیوں پر کنٹرول مشکل ہوجاتا ہے۔

ہندستان کے اردو اخبارات کو ترجمے کا مسئلہ بھی درپیش ہے حالانکہ مترجم اور صحافی کے درمیان فرق ہے۔ ترجمہ ایک فن ہے اور صحافت ایک پیشہ ہے لیکن صحافی کو ہی مترجم کا کام کرنا پڑتا ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ صحافی کو بنیادی طور پر مترجم ہونا چاہیے۔ اسی بنیاد پر اردو اخبارات میں روزگار کے مواقع بھی فراہم ہوتے ہیں۔

بالعموم یہ دیکھا جاتا ہے کہ صحیفہ نگار اپنا پورا وقت صرف ترجمے کی نذر کردیتے ہیں، صحافتی رموز و نکات ان کی دسترس سے باہر ہوجاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات، اخبار کی سرخیوں، ترتیب و تزئین اور پیش کش کے انداز میں بھونڈا پن جھلکنے لگتا ہے۔

پاکستان میں جہاں اردو صحافت کو غلبہ حاصل ہے۔ اس طرح کا سسٹم نہیں ہے۔ بلکہ وہاں مترجم، صحافی اور پروف ریڈر تینوں علاحدہ علاحدہ ہیں۔ اس لیے املا اور انشا کی شاذ و نادر ہی کوئی غلطی نظر آئے گی۔ اس کے برخلاف ہندستان کی اردو صحافت میں ترجمہ، ایڈیٹنگ اور پروف ریڈنگ ایک ہی آدمی کی ذمے داری ہے۔ اس پس منظر میں بھی اردو صحافت کے کورس کو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

اخبارات میں کمپیوٹرائزیشن کے بعد انقلابی تبدیلیاں آئی ہیں، انگریزی اور دوسری علاقائی زبانوں کے اخبارات نے روزمرہ کے کاموں کے علاوہ اس کا بہتر سے بہتر استعمال کیا ہے۔ آج یہ اخبارات اس قابل ہیں کہ لمحہ بھر میں کسی بھی موضوع پر فوراً مواد فراہم کرسکتے ہیں اور استعمال کرسکتے ہیں لیکن اردو اخبارات کا حال آج بھی پہلے جیسا ہی ہے کیوں کہ اردو صحافت نے کمپیوٹر کا صحیح استعمال نہیں کیا بلکہ اسے کتابت کی مشین بنا دیا۔ یہ محض کمپیوٹر سے صحیفہ نگاروں کی دوری کا نتیجہ ہے جب کہ دوسری زبانوں کے ان کے ہم عصر، کمپیوٹر کا زیادہ سے زیادہ اور بہتر استعمال کرتے ہیں۔ صحیفہ نگاروں میں بلالحاظ عمر کمپیوٹر سیکھنے سے کوئی دلچسپی نظر نہیں آتی...... جب کہ اس کے برخلاف، کمپیوٹر اسٹاف میں، میں نے صحافت سے نہ صرف دلچسپی دیکھی ہے بلکہ ان میں صحافت کے جراثیم بھی محسوس کیے ہیں۔

اردو صحافت میں آج تربیت کے پورے منظرنامے کو بدلنے کی ضرورت ہے اس حوالے سے جو اہم نکات سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں۔

- کیا ہم کلاس روم کو نیوز روم میں بھی تبدیل کرسکتے ہیں؟
- کیا نظریاتی تعلیم کی میعاد میں کمی کرتے ہوئے عملی تربیت کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت نکال سکتے ہیں؟ اور کیا اس عملی تربیت کے لیے صحافیوں کی خدمات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟
- کیا یونیورسٹیوں میں اردو صحافت کی تعلیم کے ساتھ ترجمے کی باقاعدہ تربیت کا بھی انتظام کیا جاسکتا ہے؟
- کمپیوٹر آپریٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے والے اردو اخبارات کے اسٹاف کو صحافت کی تعلیم و تربیت کے حصول کے لیے کس طرح ترغیب دی جاسکتی ہے؟

یہ وہ نکات ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ پیشۂ صحافت صحیح معنوں میں خوابوں اور خواہشوں کی ایک پرورش گاہ ہے۔ صحافی بننے کے عمل کی شروعات سے ہی ایک طالب علم کو یونیورسٹی اور حقیقی ماحول کے درمیان تضاد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس تضاد کو جب تک ہم ختم نہیں کریں گے اس وقت تک اردو صحافت کو تراشیدہ ہیرے نہیں مل سکیں گے۔

Executive Editor "Munsif", Hyderabad

□□□

محمد فاروق اعظمی

بچوں کی تعلیم و تربیت

کسی بھی ملک یا قوم کا بہترین سرمایہ اس کے بچے ہوتے ہیں۔ ان کے فکروخیال کی دنیا بڑے لوگوں کی دنیا سے مختلف ہوتی ہے۔ ان کی سوچ اور فکر پر ارمان اور رومان کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے بارے میں خوبصورت خواب دیکھتے ہیں اور اس کی تعبیر بھی پانا چاہتے ہیں۔ ان کے معصوم ذہنوں میں کسی چیز کے بارے میں جاننے کے لیے طرح طرح کے سوالات کلبلاتے رہتے ہیں۔ یہ سوالات کبھی بے تکے بھی ہوتے ہیں اور کبھی بڑے فکر انگیز بھی۔ بچوں کی دنیا کا مطالعہ بہت دلچسپ بھی ہے اور ضروری بھی۔ کیونکہ اگر ہم نے ان کی جبلت اور نفسیات کو سمجھنے میں غلطی کی تو یہ ان کے مستقبل کے لیے تباہ کن ثابت بھی ہوسکتا ہے۔

آج کے بچے کل کے باوقار شہری بنیں گے۔ انھیں زندگی کی ذمہ داریوں اور اس کے گوناں گوں مسائل سے نبردآزما ہونا ہوگا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت اس انداز سے ہو کہ وہ زندگی کے ہر موڑ سے کامیاب اور کامران گزر سکیں۔

اساتذہ اور والدین کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ بچوں کی پسند اور ناپسند کا پتہ لگائیں اور دیکھیں کہ کن چیزوں سے انھیں کام کی تحریک ملتی ہے۔ ان کی عادتیں اور شرارتیں کیا ہیں۔ اگر وہ غلط ہیں تو ان کی اصلاح کے لیے کیا کیا مؤثر اقدام ہوسکتے ہیں۔ ان کی ذہنی، جسمانی اور اخلاقی نشوونما میں کیا کیا چیزیں معاون ہوسکتی ہیں۔ بعض بچے والدین اور اساتذہ دونوں کے لیے مسئلہ ہوتے ہیں کیونکہ ان کی پیچیدہ نفسیات کو سمجھنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں ماہر نفسیات کی بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ سب سے پہلے ہمیں اس نکتے پر غور کرنا چاہیے کہ بچے کے اوقات کس ماحول اور کن لوگوں کے درمیان گزرتے ہیں۔ اگر ہم بغور مشاہدہ کریں تو یہ جاننا مشکل نہ ہوگا کہ بچے کی زندگی تین قسم کے ماحول میں گزرتی ہے۔ اول گھر کا ماحول، دوم محلہ، گلی اور کھیل کود کا میدان، سوم اسکول۔ بچہ اپنی معاشرتی زندگی کا آغاز اپنے گھر سے کرتا ہے۔ وہ گھر کے افراد، گھر کے ماحول اور گھر کی اشیا سے پہلے روشناس ہوتا ہے، ان میں دلچسپی لیتا ہے، ان کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ سوالات کی بوچھار کردیتا ہے کہ یہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کس لیے ہے؟ کس کے لیے ہے؟ ظاہر ہے بچے کے تمام سوالات کا تشفی بخش جواب دینا ممکن نہیں ہوتا۔ تاہم ان کے سوالات پر انھیں ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کردینا یا ٹال مٹول کرنا یا پھر غلط بیانی سے کام لینا بچے کے ذہن پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات اس کے سنگین نتائج ہوتے ہیں۔ فرض کیجیے آپ کا بچہ گیند سے کھیلتا ہوا آپ کے اسٹڈی روم میں داخل ہونا ہی چاہتا ہے کہ آپ کی ڈانٹ اور خشمگیں نگاہیں اسے دروازے پر روک دیتی ہیں پھر بھی وہ بضد ہے کہ آپ کے روم میں داخل ہوجائے مگر آپ کی سختی کی وجہ سے اس کے ارمانوں کا خون ہوجاتا ہے۔ وقتی طور پر تو آپ نے اسے ذرا دھمکا کر اپنے اسٹڈی روم میں داخل ہونے سے روک دیا مگر آپ نے یہ نہیں سوچا کہ ان دھمکیوں سے اس کے معصوم ذہن پر کیا اثرات مرتب ہوئے اسی طرح کچھ شریر بچے جو فطرتاً کھانے پینے، نہانے اور کپڑے پہننے کے معاملے میں بڑے ضدی ہوتے ہیں اور ماں باپ ان کی پسند یا ناپسند کا خیال کیے بغیر جن غیر معقول طریقوں سے انھیں "سیدھا" کرتے ہیں وہ کسی طرح بھی قرین مصلحت نہیں ہے۔ یہی بچے جو گھریلو ماحول میں ناآسودگی اور عدم توجہی اور ڈانٹ پھٹکار اور مار پیٹ کا شکار ہوتے ہیں گھر والوں کے لیے مسئلہ تو بنتے ہی ہیں، اسکول اور سماج کے لیے بھی پریشانیوں کا باعث بنتے ہیں۔

ماہر نفسیات ڈاکٹر عبدالرؤف نے اپنی کتاب "بچوں کی تربیت" میں ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک دن میرے کلینک میں ایک میم صاحب اپنے دو بچوں کو لے کر آئیں۔ ان کی شکایت یہ تھی کہ ان کے بچے دن میں کئی بار گھر سے کھسک جایا کرتے تھے اور ماں کی آنکھیں بچا کر ڈبل روٹی اور کھانے کی ایک آدھ اور چیزیں اڑا کر ساتھ لے جاتے تھے۔ جب وہ باہر ہوتے تب بھی ماں ان کی وجہ سے پریشان رہا کرتی اور گھر میں ہوتے تو اپنی ننھی بہن کو خواہ مخواہ ستاتے رہتے اور طرح طرح کی شرارتوں سے گھر کا سارا انتظام درہم برہم کیے رہتے۔ ان کے گھر میں ہونے یا نہ ہونے دونوں کی وجہ سے ماں سخت اضطراب میں مبتلا رہتی۔ ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں کہ پہلے میں نے اس خاندان اور اس کے مکان کا مختصر جائزہ لیا۔ پھر بچوں سے بے تکلف ہوا اور تحقیق شروع کی۔ جب بچے گھر سے کھسکتے تو میں بھی چپکے سے ان کے پیچھے ہولیتا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دور جاکر ایک کھنڈر اور ویران مکان میں داخل ہوجاتے جہاں ایک میلا کچیلا کتا دُم ہلا کر ان کا استقبال کرتا ہے۔ بچے چرائی ہوئی چیزیں اسے کھانے کو پیش کرتے ہیں اور پھر پہروں اس سے کھیلتے رہتے ہیں۔ میں کئی دن یہ تماشہ دیکھتا رہا۔ پھر نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہ لگی۔ بات دراصل یہ تھی کہ بچوں کے لیے گھر میں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا حتی کہ دیکھنے کے لیے ٹی وی بھی نہ تھا۔ چھوٹی بچی کی پیدائش کے بعد انھیں یہ وہم ہوگیا کہ والدین نووارد سے ترجیحی سلوک کرتے ہیں۔ کھنڈر مکان میں غلیظ کتے سے کھیل کر انھیں کچھ فرحت حاصل ہوجاتی تھی مگر جب وہ گھر لوٹتے تھے اور چوری کرنے اور بھاگنے پر ماں ان کے کان کھینچتی تھی تو وہ اس "ناانصافی" کا انتقام ننھی کو تنگ کرنے اور گھر میں شور مچانے کی صورت میں لیتے تھے۔ اس واقعے میں والدین اور اساتذہ کے لیے بچوں کی ذہنی تربیت کرنے اور ان کے ساتھ سلوک روا رکھنے کے کئی پہلو مضمر ہیں۔

دوسرا اہم ماحول محلے کے گلی کوچے ہیں جہاں بچے اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ کھیل کود اور دیگر تفریحات میں وقت گزارتے ہیں۔ ہمارے محلے کی گلیاں تنگ ہوتی ہیں، نالی اور نالدان کھلے ہوتے ہیں، جابجا کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ راہ گیر آتے جاتے رہتے ہیں اور ہمارے بچے انھی تنگ گلیوں میں کرکٹ اور گلی ڈنڈا کھیلتے رہتے ہیں۔ گیند گندی اور متعفن نالیوں میں چلی جاتی ہے، انھیں اپنے ہاتھ سے نکالنے اور اپنا کھیل جاری رکھنے میں کوئی گھن نہیں آتی۔ ان گلیوں کا ایک نقشہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی نکڑ پر کوئی چاٹ والا اپنے گندے برتن میں چاٹ لیے بیٹھا ہے، مکھیاں بھنبھنارہی ہیں اور چند بچے اس کے آس پاس منڈلا رہے ہیں اور شوق سے چاٹ کھا رہے ہیں۔ گلی کوچے کے اسی ماحول میں ہمارے بچے گالی گلوچ، لڑائی جھگڑے، ہاتھاپائی کی مشق بھی کرتے ہیں اور جب کبھی یہ سلسلہ دراز ہو جاتا ہے تو بچوں کے والدین بھی اس ''کارخیر'' میں شریک ہوجاتے ہیں۔ یہ صورت حال بڑی تشویشناک ہے جس کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ انھی گلیوں میں بچوں کے اندر بُری عادتیں اور خصلتیں پروان چڑھتی ہیں۔ گلی کی شرارت، بے راہ روی اور آوارہ گردی انھیں مجرمانہ رجحانات کی طرف مائل کرتی ہے۔ والدین کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ وہ اپنے بچوں کو گلی محلے کے گندے ماحول اور بری صحبت سے بچائیں۔

بچے کی تعلیم و تربیت کی تیسری سب سے اہم جگہ اسکول ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ The destiny of a country is shaped in calss room یعنی کسی ملک کی تقدیر کلاس روم میں متشکل ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے اسکولوں میں جس فکر ونظر کی تعلیم وتربیت ہوگی ملک کی تصویر بھی اسی سانچے میں ڈھلے گی۔ اسکول کا ماحول، اس کا نظم وضبط، اساتذہ کی قابلیت وصلاحیت اور ان کے اخلاق و عادات اور کردار جیسے کچھ ہوں گے ان کا پرتو طلبہ کی تعلیم وتربیت پر ضرور پڑے گا۔ بچے اپنے گھر اور محلے سے نکل کر جب اسکول کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو ایک نئے ماحول اور نئے تجربے سے دوچار ہوتے ہیں۔ اسکول اس چہار دیواری کا نام نہیں ہے جہاں بچوں کی بھیڑ محض اس لیے جمع ہوجاتی ہے کہ انھیں کچھ لکھنا پڑھنا سکھا دیا جائے بلکہ اسکول کی دنیا اخلاص ومحبت کی دنیا ہے، معصوم روحوں کی دنیا ہے، اعلا اقدار کی دنیا ہے۔ یہاں آنے کے دو مقاصد ہیں۔ ایک یہ کہ بچوں کو مہذب اور بااخلاق شہری بنایا جائے۔ دوسرے یہ کہ آئندہ زندگی میں کسی مناسب فن کو بطور پیشہ اختیار کرنے میں ان کی مدد اور رہنمائی کی جائے۔ اس دنیا کے بنانے اور سنوارنے کا کام وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو خود پختہ سیرت وکردار کے حامل ہوں اور حصولِ زر اور مادی منفعت کے جذبے سے بے نیاز ہوکر خدمتِ خلق اور تعمیر حیات کو اپنا مقصد حیات سمجھتے ہوں۔ اسکول میں استاد کی حیثیت ایک کیمیاگر کی ہے۔ وہ دریائے شور کو شیریں اور صحرا کو گلزار بنانے کا کام انجام دیتا ہے وہ ایک سنگتراش ہے جو اپنے شاگردوں کو اپنے تخیل کے مطابق تراش سکتا ہے مگر یہ ایک المیہ ہے کہ ہمارے بیشتر ادارے تعمیر حیات اور حصول اقدار کے بجائے تکمیلِ اغراض کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ جو لوگ درس وتدریس سے وابستہ ہورہے ہیں ان میں سے بیشتر کی صلاحیت نہ قابلِ اطمینان ہے نہ اخلاقی معیار قابلِ تقلید۔ نہ انھیں اپنے پیشے کی حرمت وتقدس کا پاس ہے نہ اس سے کوئی جذباتی لگاؤ۔ نہ وہ اس میدان کے آدمی ہیں نہ یہ میدان ان کے لیے سازگار۔ وہ معصوم بچوں کی تربیت کیا کریں گے اور انھیں کیا سکھائیں گے جبکہ وہ خود قابلِ اصلاح ہیں۔ اس سلسلے میں حکومت اور انتظامیہ کے رول پر بھی کچھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اساتذہ کے تقرر میں جو بے اعتدالیاں ہوتی ہیں اور ان اساتذہ کو جن حالات اور جن شرح تنخواہ پر کام کرنا ہوتا ہے، یہ تمام عوامل بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت پر براہ راست منفی اثرات ڈالتے ہیں۔ ہمارے یہاں ابتدائی جماعتوں کو پڑھانے کے لیے کم سے کم ایس.ایس.سی. ڈی. ایڈ. یا ایچ. ایس.سی. ڈی.ایڈ کا تقرر ہوتا ہے اور پرائمری کے ان ٹیچروں کی جو بھی صلاحیت ہوتی ہے وہ سب پر آشکارا ہے۔ آجکل ''شکشک سیوک'' کی برائے نام معاوضہ پر تقرری ہورہی ہے۔ مگر ہمارے ماہرین تعلیم دانشوروں کو شاید یہ بات معلوم نہیں ہے کہ A dissatisfied teacher can harm the country more than the army of a foreign enemy.

یعنی ایک غیر مطمئن ٹیچر غیر ملکی دشمن کی فوج سے زیادہ اپنے ملک کو غارت کرسکتا ہے۔ کاش ہمارے ارباب حل وعقد اور دانشورانِ قوم اس تلخ حقیقت کو سمجھیں۔

استاد اور تدریس کی اہمیت کو جاپان نے سمجھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اپنی تباہی اور بربادی کی راکھ سے ایک نیا اور ترقی یافتہ جاپان جس سرعت کے ساتھ دنیا کے نقشے پر ابھرا ہے اسے پوری دنیا نے حیرت واستعجاب سے دیکھا ہے۔ جاپان کی ترقی کا راز یہ ہے کہ اس نے جنگِ عظیم میں اپنی تباہی کے بعد سب سے پہلے پرائمری اور سیکنڈری ایجوکیشن پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ اچھی تعلیم کے لیے اچھے استاد کی ضرورت ہے۔ حکومتِ جاپان نے ٹیچروں کی تنخواہوں کو پُرکشش بنایا اور ان کو وہی سہولتیں دیں جو ایک منسٹر کو نصیب ہیں بجائے مقداری تعلیم (.Quantitative Edu) کے معیاری تعلیم (Qualitative Education) پر زور دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ تیس چالیس سال میں جاپان دنیا کا سب سے ترقی یافتہ ملک بن گیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں اس نے اتنی ترقی کرلی کہ امریکہ کو بھی اس نے پیچھے چھوڑ دیا۔ آج دنیا کے مارکیٹ میں ہر جاپانی مال اپنا امتیازی نشان اور اعلا معیار رکھتا ہے اور یہ سب نتیجہ ہے اس طریقۂ تعلیم اور تعلیمی پالیسی کا جو جاپان نے اپنایا۔

ہمارے ملک کا اصل سرمایہ ہمارے بچے ہیں۔ ان کی صحیح تعلیم وتربیت کی سخت ضرورت ہے۔ ہمارے بچے ذہین بھی ہیں، ہنرمند بھی ہیں، صحت مند بھی ہیں اور باصلاحیت بھی ہیں مگر سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ انھیں تعلیم کا وہ ماحول اور سہولت نہیں ملتی جو ایک معیاری تعلیم کے لیے ضروری ہے۔

7-B-Dr. Iqbal Colony, Mehron, Jalgaon (Maharashtra)

□□□

تحریر: شیفالی واسدیو
ترجمہ: نصرت ظہیر

ہم خواب کیوں دیکھتے ہیں

جیسے انسانی دماغ کے قبرستان کا در کھلتا ہے، ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی حقیقتوں اور بے لگام جذبات کی توانائی کا پورے انسانی وجود کو ہلا کر رکھ دینے والا مسحور کن تھیئٹر شروع ہو جاتا ہے۔ بے چہرہ بھوتوں کی پرچھائیاں، رینگتی ہوئی کالی چمگادڑیں، خون پی جانے والی چمگادڑیں، خون آلود ہتھیار، اسپتالوں کے وارڈ، گنجے سر، یا پھر سفید کمل کے پھولوں سے بھرا تالاب، میٹھے پھلوں کی ٹوکریاں، بے حد باریک خوبصورت جالے، ہاتھی دانت جیسے سفید ستونوں سے لپٹے اور لہراتے ہوئے پردے، مندروں کی گھنٹیاں، بھجن یا ورد کی آوازیں، ایک شفقت بھرا لمس یا شہوانی ہم آغوشی! کچھ خواب لوگوں کو خوشی سے بھر دیتے ہیں اور بعض سے ہیبت یا کراہت کا شدید احساس طاری ہو جاتا ہے۔

اٹھتیس سالہ نکتا رمن دہلی کی ایک نوکری پیشہ خاتون ہیں۔ انھیں ایک خواب نے ہلا کر رکھ دیا۔ اپنے خاوند کو انھوں نے خواب میں ایک ایسی عورت سے ہم آغوش دیکھا جس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ اس خواب نے انھیں طلاق کے اندیشے میں مبتلا کر دیا۔ چند روز بعد جب وہ دفتر سے قبل از وقت ہی گھر پہنچ گئیں تو کیا دیکھتی ہیں، ان کا خاوند ان کی سب سے اچھی دوست کی بانہوں میں تھا! خواب ہو بہو سچ نکلا۔ دونوں میں طلاق ہوگئی اور خاوند نے دوسری عورت کے ساتھ شادی کا ارادہ کر لیا۔

لیکن شادی سے پہلے رمن نے ایک اور خواب میں دیکھا کہ اس کی سابق دوست دلہن کے لباس میں شادی کے منڈپ میں بیٹھی دولھے کا انتظار کر رہی ہے وہ جان گئیں کہ یہ شادی ہرگز نہیں ہوگی۔ اور یہ خواب بھی سچا نکلا۔ تو کیا رمن کو بعد میں ہونے والے واقعات کا پیشگی علم ہو جانے کی خاص طاقت ملی ہوئی تھی؟ یا خوابوں میں قبل از وقت خبردار کر دینے والا کوئی نظام پوشیدہ ہے جو آپ کو آنے والے کسی بحران سے ہوشیار کر دیتا ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ کچھ خواب ہمیں پوری تفصیل کے ساتھ یاد رہتے ہیں جبکہ کئی خواب قطعی یاد نہیں آتے۔ کیا دوزخی اور کئی بار جنتی قسم کے، یہ واضح نظارے ہماری بیداری کی حقیقتوں کا آئینہ ہوتے ہیں؟

سگمنڈ فرائڈ نے خوابوں کی تعریف بیان کرتے ہوئے انھیں ''لاشعور کو جانے والی شاہراہ'' قرار دیا تھا۔ اس کے سو سال بعد اب جا کر نئی تحقیقات نے خوابوں کے بارے میں چکرا دینے والے سوالوں کا کسی حد تک جواب دینا شروع کیا ہے۔ یونیورسٹی آف پیرس میں ایک بین الاقوامی کانفرنس ''ہندستانی ثقافت میں نیند اور خوابوں کی اہمیت'' کے موضوع پر ہوئی۔ اس میں کئی حیرت انگیز باتوں کا انکشاف ہوا۔ یونیورسٹی آف فرینکفرٹ کے مارٹن مٹ ویڈ نے ''آیورویدا میں خواب اور موت کا عمل'' کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا جس میں خوابوں کے مطالعے کے ذریعے ان علامتوں کو سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی جو آیوروید میں موت اور امراض کے ضمن میں تجویز کی گئی ہیں۔ اپنی تحقیق میں انھوں نے پایا کہ جو لوگ بیمار ہوتے ہیں ان کو خوابوں میں جن، بھوت، کتے، اونٹ، گدھے، سانپ اور پانی و آگ جیسے عناصر زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی میں اوجھا اور طبیب خواب کو ایک ایسی کلید تصور کرتے تھے جس سے مریض کی تمام تر کیفیت کا پتہ چل جاتا تھا۔

مثال کے طور پر اگر بازو میں جلن کا خواب آئے تو عام طبیب یہ دیکھتا تھا کہ کہیں مریض کو جلد کی بیماری تو نہیں۔ لیکن روایتی معالج اس خواب کے ذریعے مریض کی جذباتی صحت کو جانچتا پرکھتا تھا اور اس کے خاندانی پس منظر میں بھی جھانکتا تھا۔ مارٹن مٹ ویڈ نے بیماریوں اور خوابوں میں ایک مخصوص ربط دریافت کیا۔ قدیم آیورویدک کتب میں سانپوں کو ہائپر ٹینشن سے جوڑ کر دیکھا گیا ہے۔ دہلی میں ایک 31 سالہ خاتون سانپوں اور بھوتوں کے ڈراؤنے خوابوں سے پریشان تھی۔ وہ ایک ماہر نفسیات کے پاس گئی تو اس نے میڈیکل ٹیسٹ تجویز کیا۔ بالآخر یہ پتہ چلا کہ وہ شدید ذہنی دباؤ اور ہائی بلڈ پریشر کے مرض میں مبتلا تھی۔ ہندستانی اور دیگر ملکوں کے تجزیہ کار اب خوابوں کی نئی لغت تیار کر رہے ہیں۔ جہاں اس لغت میں اساطیری علامتوں کو برقرار رکھا گیا ہے وہیں دنیا کے کسی بھی شخص کے خیالات، اشکال اور تمناؤں کے مترادفات کو بھی حروف تہجی کے مطابق جگہ دی گئی ہے۔ عمودی چٹانوں کی

بجائے لوگ اب اپنے خوابوں میں خود کو کثیر منزلہ عمارتوں سے گرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ خوشبودار اگربتیوں کی جگہ عطر (پرفیوم) نے لے لی ہے۔ شہوانی خواب جنسی جذبات کو دبانے والے معاشروں کے افراد کا زیادہ پیچھا کرتے ہیں بہ نسبت ان لوگوں کے جنھیں اپنی جنسی خواہشات کو پورا کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ شادی سے قبل تعلقات رکھنے والے جوڑے اپنے شریک حیات سے متعلق جوشیلے شہوانی خواب دیکھتے ہیں۔ جوان لڑکیاں سیکسی پہناوے کے خواب دیکھتی ہیں، سرخ جوڑے کے نہیں جو ماضی میں غیر شادی شدہ عورتوں کے خوابوں پر غالب رہتے تھے۔

جہاں ابتدائی زمانے کا آدمی شکار کے لیے جنگلی جانور کے تعاقب کا خواب دیکھتا تھا اور پانڈوؤں کو رتھوں کو سپنے آتے تھے وہاں دور جدید کا آدمی فراری کار کا خواب دیکھتا ہے۔ نفسیاتی تجزیہ کار سدھیر کاکر، خوابوں کا تجزیہ جن کی تحقیق کا میدان ہے اس کی توضیح یوں کرتے ہیں۔ ''اہم چیز ہے رفتار، علامتیں بدل گئی ہیں۔ لیکن بنیادی کشمکش وہی ہے!''

اسی کے ساتھ ایک نیا مطالعہ ہارورڈ میں کیا گیا اور یونیورسٹی آف ٹیکساس نے ایک تجربے کے ذریعے ثابت کیا کہ خواب وہ (خیالات) ہیں جنھیں ہم بیداری کے اوقات میں دبا دیتے ہیں اور یہ کہ خواب پیچیدہ خواہشوں اور نامکمل آرزوؤں کو ظاہر کرتے ہیں۔ ڈینیئل ویگنر نے جو کہ تجزیاتی ٹیم کے رہنما تھے، پایا کہ وہ دن بھر کے خیالات و واقعات کے فضلے کو ہی اپنے خوابوں میں دیکھ رہے تھے۔ یہ لگ بھگ وہی بات تھی جو فرائڈ نے ایک صدی پہلے دریافت کرلی تھی۔ بستر پر سوتے ہی ان خیالات کے اوپر رکھا ہوا ڈھکن ہٹ جاتا ہے جنھیں دماغ اپنے اندر لپیٹے رہتا ہے۔ بالخصوص وہ خیالات جو ہمیں پریشان کن لگتے ہیں یا جنھیں ہم اپنے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔

دہلی میں رہنے والی مصنفہ مدھو ٹنڈن، جنھوں نے پیرس کی کانفرنس میں ایک مقالہ پڑھا تھا، کہتی ہیں کہ اپنی آنے والی کتاب ''خوابوں سے مکالمہ'' (Dialogue with dreams) کے لیے انھوں نے 100 لوگوں سے بات چیت کرنے کے بعد پایا کہ ان کے خواب تین سطحوں پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ پہلی سطح وہ جہاں خواب ذہنی حالات اور رویے کا آئینہ ہوتے ہیں۔ دوسری سطح پر وہ غیر طبعی کیفیت میں لے جانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ مسئلوں کو سلجھانے میں مدد کرتے ہیں، آنے والے واقعات کی خبر دیتے ہیں اور کئی بار تو موت کی اطلاع بھی دے دیتے ہیں۔ تیسری سطح پر خواب روحانی بیداری کے اعلاترین مقام تک پہنچانے والا راستہ بن جاتے ہیں۔

زیادہ سے زیادہ معالج اب یہ ماننے لگے ہیں کہ روحانی معالجے کو لوگوں کے اندرون میں ڈھونڈنے پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ وہ مریضوں کو اپنے خوابوں پر توجہ دینے کا مشورہ دیتے ہیں۔ نفسیاتی معالج رَشنا اِمہاسلی کہتی ہیں۔ ''زیادہ تر لوگوں کو جو مشورے کے لیے آتے ہیں، یہ پتہ ہی نہیں ہوتا کہ خواب دراصل اندرونی آوازیں ہیں جو انھیں آگے بڑھنے کے لیے کہتی اور اکساتی ہیں۔'' وہ یہ بھی کہتیں ہیں کہ لوگوں کو ان کے خوابوں کا مفہوم سمجھانے میں مدد دینا بہت ضروری ہے کیونکہ وہ بالعموم اساطیری علامات سے پُر ہوتے ہیں۔ امہاسلی کہتی ہیں۔ لوگ خواہ مذہبی ہوں یا نہ ہوں، رام، سیتا، دُرگا، راون وغیرہ سے مشابہ کردار جس طرح دن کے خوابوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اسے دیکھ کر میں حیران رہ جاتی ہوں۔ وہ بری طرح دبا کر رکھی گئی ایک شادی شدہ خاتون کے کیس کا حوالہ دیتی ہیں جس کا علاج چل رہا تھا اور جس کا خاوند شادی کے بعد کے کئی برسوں تک اس کی جانب سے خاصا لاپرواہ رہ چکا تھا۔ ''اس کے دبے ہوئے غصے کا ایک حصہ اُن پُرتشدد خواب ہائے پریشاں کی صورت میں باہر نکلتا ہے جس میں وہ اپنے خاوند کو چیر پھاڑ ڈالتی ہے۔ یہ ایک تلافی کا طریقہ ہے کیونکہ اسے دن میں اظہار کی آزادی نہیں ملتی۔'' امہاسلی مزید کہتی ہیں۔'' ماضی کی خیالی داستانیں اور اساطیر معلومات کا خزانہ ہیں جن سے ہمیں ان گتھیوں کو سلجھانے میں حقیقی رہنمائی ملتی ہے۔ اگر ہم ان کی اہمیت کو نظر انداز کریں گے تو یہ حماقت ہوگی۔''

خوابوں سے کسی واقعے کا پیشگی علم کیسے ہو جاتا ہے اس چکرا دینے والے سوال کا بھی کچھ جواب اب ملنے لگا ہے۔ ایشیائی ثقافت اور بدھسٹ خوابوں کی اسکالر سیرینٹی ینگ نے پتہ لگایا ہے کہ شعور جتنا زیادہ ''مراقبہ'' (دھیان) کی حالت میں ہوگا خواب اتنے ہی واضح (باعلم) ہوں گے۔ واضح خواب وہ ہوتا ہے جس میں دورانِ خواب آدمی کو احساس رہے کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ تجربات سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ واضح خوابوں کے سچ نکلنے کا امکان قوی تر ہوتا ہے کیوں کہ ان میں صفائی، شگفتگی اور کھلے پن کا احساس پایا جاتا ہے۔ ینگ نے بدھسٹ سوانح عمریاں اور ادبی، طبی اور مذہبی کتب کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ ان کا موازنہ انھوں نے ہندستان، بنگلہ دیش، نیپال اور تبت میں لوگوں سے ان کے خوابوں کے بارے میں کی گئی پرسش احوال سے کیا اور پایا کہ پیش گوئی، اعلاشعوری کیفیت اور باطنی علم و علاج کے سلسلے میں خواب ایک طاقت ور کردار ادا کرتے ہیں۔ ینگ کہتی ہیں کہ ہندستان میں خوابوں کی دنیا کو مقدس خیال کیا جاتا ہے۔ ان کے بقول'' خواب ہمیں معلومات دیتے ہیں۔ اس لیے

کوئی بھی فیصلہ کرتے وقت ان پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔"

تاہم کاکرکو، جو خود بھی جدید اور قدیم ہندستان میں خوابوں کے بارے میں لکھ چکے ہیں اس میں شک ہے۔ ان کا کہنا ہے "الہامی خواب علم نجوم کی طرح ہیں (جس میں) ہم صرف اسے یاد رکھتے ہیں جو ٹھیک نکلتا ہے اور باقی کو بھول جاتے ہیں۔"

خواب، نیند کے آر ای ایم (Rapid Eye Movement) مرحلے میں، یعنی آنکھوں کی تیز گردش کے دوران دکھائی دیتے ہیں۔ یہ مرحلہ نیند آنے کے تقریباً 90 منٹ بعد شروع ہوتا ہے۔ اس وقت جسم مفلوج ہوجاتا ہے لیکن دماغ حرکت میں رہتا ہے۔ اس کے بعد غیر آر ای ایم مرحلہ (Non REM Phase) آتا ہے جو گہری نیند کے چار ذیلی مرحلوں پر مشتمل ہوتا ہے اور جس میں دماغ بے حرکت رہتا ہے۔ لوگ ایک رات کی نیند میں کئی مرتبہ ان حالتوں سے گزرتے ہیں۔ یہ ایک عام طریق عمل ہے جسے نیند کا طرز تعمیر یا Sleep Architecture کہتے ہیں اور جو عمر کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ لیکن معاملہ گڑبڑ بھی ہوسکتا ہے مثلاً آر ای ایم کی بے ترتیب کیفیت میں مریض نیند کے مرحلوں کے دوران عجیب وغریب انداز میں حدوں سے باہر چلے جاتے ہیں اور نیند میں خواب دیکھنے کی نقل یا اداکاری کرنے لگتے ہیں۔

خوابوں کی تھیٹریکل آرائش وتزئین اور ان کے بے لگام ہوجانے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دماغ کے دائیں حصے کی غیر منطقی، جذباتی اور بصارتی فطرت آدمی پر غالب آجاتی ہے جبکہ دماغ کا وہ بایاں حصہ سویا رہتا ہے جس میں اس پر منطقی استدلال سے قابو رکھنے کی طاقت ہوتی ہے۔

دوسری انتہا، ماہرین کے مطابق وہ گہری بے خواب نیند کی کیفیت ہے جس میں مریض باربیچوریٹس (ایک طرح کا تیزابی نمک Barbiturates) یا نفسیاتی مریضوں کو دی جانے والی ادویات کی بدولت پہنچ جاتا ہے اور جو آر ای ایم مرحلوں کو دبا دیتی ہیں۔ سریع الاثر دواؤں کے بارے میں یہ ثابت ہوچکا ہے کہ ان سے نیند غائب ہوجاتی ہے اور اس کی جگہ وہ نیند کے واہمے کی نفسیاتی کیفیت پیدا کردیتی ہیں۔

خوابوں کا یاد رہنا بھی ایک چکرا دینے والا معاملہ ہے۔ تاہم اب ان سوالوں کا جواب ملنے لگا ہے کہ کیوں بعض خواب تا عمر یاد رہتے ہیں جبکہ دوسرے بستر سے نکلتے ہی ذہن سے محو ہوجاتے ہیں۔ یونیورسٹی آف آیووا (امریکہ) میں علم نفسیات کے پروفیسر ڈیوڈ واٹسن کے گزشتہ برس شائع ہونے والے تحقیقی مقالے میں انکشاف کیا گیا ہے کہ خواب جتنا عجیب ہوا اتنا ہی لوگ اسے یاد رکھتے ہیں۔ واٹسن نے 193 لوگوں سے تین ماہ تک اپنے خوابوں کا حساب رکھنے کو کہا اور اس کا موازنہ سونے کے وقت کی ان کی عادتوں اور پی گئی کافی اور الکحل کی مقدار سے کیا۔ انھوں نے پایا کہ جن لوگوں کے سونے کا وقت بے ترتیب تھا ان کی نیند مختصر رہی اور انھیں اپنے خواب زیادہ یاد رہے۔ یہی بات تخلیقی وتصوراتی ذہن رکھنے والوں اور انوکھے تخیلات کی دنیا میں رہنے والوں کے یہاں دیکھی گئی۔ الکحل یا ادویات چھوٹنے کے بعد کی مشکلات سے گزرنے والوں کے یہاں پایا گیا کہ انھیں شدید نوعیت کے ڈراؤنے خواب زیادہ نظر آئے۔

ایک اور جائزے سے منکشف ہوا کہ جو لوگ دماغی رسولی (Brain Tomour) کے شکار ہیں یا جن کا دوران خواب متحرک رہنے والا دماغی حصہ زخمی ہوگیا ہے، انھیں بھی ڈراؤنے خواب زیادہ آتے ہیں۔

جدید تحقیقات میں سب سے اہم موڑ غالباً اس احساس سے آیا ہے کہ لوگ کسی بے ہوش آدمی سے اس طرح گفتگو کرسکتے ہیں جس طرح اپنے کسی قریبی دوست سے کرتے ہیں۔ بنگلورہ میں رہنے والی شری پودورجن کی کتاب "خواب۔ ایک پراسرار دنیا" (Dreams-A Mystic World) حال ہی میں شائع ہوئی ہے، کہتی ہیں۔ "اگر ہم خوابوں کے تجزیے سے ہم رشتہ کرکے اپنی چھٹی حس کو تیز دھار بنا سکیں تو اس کے نتائج زبردست نکلیں گے۔"

اس میں ٹنڈن یہ اضافہ کرتے ہیں کہ کوئی بھی شخص ضروری دباؤ ڈال کر اپنے خوابوں کو یاد کرسکتا ہے، ان کی گہرائی میں جاسکتا ہے اور یوں اعلا ترین باخبری کے مقام تک پہنچ سکتا ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ نئی تحقیق اس طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ درحقیقت خواب ہی نیند کا اصل مقصد ہیں۔ خواب انسان کے دبے کچلے جذبات کو سامنے لاکر اس کی دماغی صحت کو ٹھیک رکھتے ہیں اگر ایسا نہ ہو تو آدمی فریب خیالی اور دماغی اضطراب وخلل کا شکار ہوسکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خوابوں کی دنیا کے گہرے اسرار کو سمجھنے کے لیے خوابوں پر تحقیق کرنے والوں کو ابھی اپنی بہت سی نیندیں خراب کرنی ہوں گی۔ لیکن تب تک، جیسا کہ ینگ کا مشورہ ہے، زیادہ بامعنی یہ ہوگا کہ ہم "سوئے رہیں"۔ کیوں کہ نیند ہی سب سے بڑی علامت ہے یہ جاننے کی کہ دماغ میں کیا کچھ ہوچکا ہے اور کیا سامنے آنے والا ہے۔

(بشکریہ "انڈیا ٹوڈے" دہلی، 19/ اپریل 2004)

□□□

سید امتیاز الدین

عظیم گلوکارہ ــــ ایم.ایس. سبّولکشمی

بھارت رتن ایم.ایس. سبّولکشمی 11 دسمبر 2004 کی شب 88 سال کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ اُن کے گزر جانے سے بھکتی رس میں ڈوبی ہوئی ایک خوبصورت آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ اُن کا انداز اتنا دل نشیں تھا کہ سننے والے مسحور ہو جاتے تھے۔ سبولکشمی جنھیں عام طور پر ''ایم ایس'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا' 16 ستمبر 1916 کو مدورئی میں پیدا ہوئیں۔ اُن کا تعلق ایک غریب خاندان سے تھا۔ اُن کی والدہ وینا بجاتی تھیں۔ سماج میں اُن کی عزت تھی لیکن گھر کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ سبولکشمی نے موسیقی کی ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی۔ وہ تیرہ سال کی عمر سے ہی اسٹیج پر گانے لگی تھیں۔ بزرگوں کا ادب اور انکساری کا جذبہ اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جس کے سبب چھوٹے بڑے سب اُن سے محبت کرتے تھے۔

سبولکشمی کو موسیقی کا فن ایسے ہی فطری انداز سے آیا جیسے درختوں کی شاخوں پر کونپلیں پھوٹتی ہیں یا پھل پھول لگتے ہیں۔ جب اُن کی عمر 20 سال سے کچھ اوپر ہوئی تو اُن کی ملاقات سداشیوم سے ہوئی جو ایک تامل اخبار نکالتے تھے اور ملک کی تحریک آزادی سے وابستہ تھے۔ 1940 میں سداشیوم اور سبولکشمی کی شادی ہوگئی۔

سبولکشمی نے کم و بیش دس سال فلموں میں بھی کام کیا۔ ان کی پہلی فلم ''ساوتری'' اپنے شوہر سداشیوم اور کالکی کرشنا مورتی کی مالی امداد کے لیے تھی جو ایک قومی اخبار نکالنا چاہتے تھے اور اُس کے لیے سرمایے کی ضرورت تھی۔ سبولکشمی کو یہ اعزاز بھی حاصل رہا کہ ان کی فلم ''میرا'' کی ابتدا سروجنی نائیڈو کی تعارفی تقریر سے ہوتی ہے۔

سبولکشمی اپنے ریاض اور پیدائشی ہنر پر قناعت کر کے بیٹھنے والی فنکارہ نہیں تھیں۔ انھوں نے اپنے دور کے مشہور استادوں سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ سدھیشوری دیوی چھ ماہ تک اُن کے گھر رہیں اور انھیں ٹھمری، بھجن اور خیال کی تعلیم دی۔ ایم.ایس. نے کرناٹک موسیقی کی ترویج کے لیے دنیا بھر کے دورے کیے۔ انڈیا فیسٹول لندن کا آغاز 1982 میں سبولکشمی کی موسیقی سے ہوا تھا۔ انھوں نے ٹوکیو، بنکاک، ہانگ کانگ، ملیشیا اور کئی اہم ممالک میں اپنے پروگرام پیش کیے۔ وہ روس، یورپ اور امریکہ بھی گئیں اور اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔

ایم.ایس. سبولکشمی گاندھی جی، جواہر لال نہرو اور سی راج گوپال چاری سے بھی بہت قریب رہیں۔ ایک بار نہرو جی مدراس کے دورے کے بعد دہلی لوٹ رہے تھے۔ ایئرپورٹ جاتے ہوئے راستے میں انھیں خیال آیا کہ وہ سبولکشمی سے ملے بغیر ہی واپس ہو رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی گاڑی کو سبولکشمی کے گھر کی طرف موڑنے کے لیے کہا اور اس طرح تھوڑی دیر اس عظیم موسیقارہ کے مکان پر رک کر وہ ایئرپورٹ گئے۔ سبولکشمی کے بارے میں ایک دفعہ نہرو جی نے کہا تھا کہ میں کیا ہوں؟ محض ایک وزیر اعظم! لیکن میرے سامنے موسیقی کی ملکہ ہے۔ گاندھی جی کو سبولکشمی کی آواز اتنی پسند تھی کہ انھوں نے کہا تھا کہ سبولکشمی کے منھ سے ادا کیے ہوئے سادہ بول مجھے دوسروں کے گائے ہوئے نغموں سے زیادہ پسند ہیں۔ سی راج گوپال چاری سے بھی سبولکشمی کو بڑی عقیدت تھی۔ راجہ جی کی زندگی میں نشیب و فراز آئے لیکن ایم ایس سبولکشمی کی عقیدت اور وفاداری میں کبھی فرق نہیں آیا۔ دنیا کے عظیم موسیقار یہودی منوہین اور ہمارے عہد کے بابائے موسیقی خاں صاحب بڑے غلام علی خاں بھی سبولکشمی کے فن کے معترف تھے۔ ایک بار جب سبولکشمی کے کانسرٹ کے بعد عالمی شہرت یافتہ فن کار زوبن مہتا کو اپنا پروگرام پیش کرنا تھا تو ان کو بڑی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ اندرا گاندھی نے ایک پروجیکٹ کے افتتاح کے بعد کہا تھا کہ یہ پروجیکٹ بہت فائدہ مند ہوگا کیوں کہ اس کے افتتاح کے موقع پر سبولکشمی نے دعائیہ بھجن گایا تھا۔ راج کپور نے بڑی عقیدت سے اپنی بیٹی کی شادی کے موقعے پر سبولکشمی کو دعوت دی تھی اور بھجن سنانے کی فرمائش کی تھی۔ راجیو گاندھی نے ایک پُرہجوم جلسے میں لوگوں کو چیرتے ہوئے راستہ بنایا تھا اور سبولکشمی سے ملاقات کی تھی۔

ایسی غیر معمولی شہرت و مقبولیت کے باوجود سبولکشمی ہمیشہ ہمہ تن انکسار رہتی تھیں۔ وہ اپنے ہر پروگرام سے پہلے اُس کی کامیابی کی دعا کرتی تھیں۔ سبولکشمی کو اعزازات بھی بہت ملے۔ ایک مرتبہ رکمنی دیوی ارنڈیل نے ازراہِ مذاق سبولکشمی سے کہا تھا کہ تمھیں دوسروں کے لیے بھی کچھ انعامات و اعزازات چھوڑ دینے چاہئیں۔ سبولکشمی کو 1954 میں پدم بھوشن کا خطاب ملا تھا۔ 1975 میں پدما وبھوشن اور 1988 میں کالی داس سمان سے نوازا گیا۔ اس کے بعد کونارک سمان، میگسے سے ایوارڈ، سنگیت ناٹک اکادی کی فیلوشپ، استاد حافظ علی خاں ایوارڈ اور اندرا گاندھی قومی یک جہتی ایوارڈ سے انھیں نوازا گیا۔ وہ موسیقی کی نیشنل پروفیسر تھیں، آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کی اعزازی پروڈیوسر بھی تھیں۔ سری وینکٹیشور یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، بنارس ہندو یونیورسٹی، مدراس یونیورسٹی اور وشوا بھارتی شانتی نکیتن نے انھیں ڈاکٹر آف لیٹرس کی اعزازی ڈگریاں دی تھیں۔ آخر میں جب انھیں 1998 میں ملک کا سب سے بڑا قومی اعزاز ''بھارت رتن'' دیا گیا۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ اس اعزاز کے ملنے سے ایک سال پہلے 1997 میں سبولکشمی کے شوہر اور گرو سداشیوم کا انتقال ہو چکا تھا۔ سبولکشمی کو اپنے شوہر سے بے حد محبت تھی۔ وہ شوہر کی کہی ہوئی ہر بات کو اپنے لیے ایک ایسا حکم سمجھتی تھیں جسے کبھی ٹالا نہیں جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سداشیوم کے انتقال کے بعد وہ بجھ سی گئی تھیں۔ انھوں نے تقریباً تنہائی اختیار کر لی اور اسٹیج پروگرام پیش کرنا چھوڑ دیا۔ ان کی صحت بھی روز بروز بگڑتی گئی۔

صاف ستھری زندگی گزارنے والی، منکسر المزاج سبولکشمی بحیثیت گلوکارہ اپنی نظیر آپ تھیں۔ اُن کا کوئی ثانی نہ تھا۔ وہ ایک عہد ساز فن کارہ تھیں۔ وہ ایک خدمت گزار اور وفا شعار بیوی، شفیق بزرگ خاندان اور سچی محب وطن تھیں۔ پچھلے ساٹھ برسوں میں انھوں نے بے شمار پروگرام پیش کیے جن میں سے بیشتر کا تعلق کسی نہ کسی نیک مقصد سے تھا۔ ان پروگراموں سے ہونے والی جملہ آمدنی وہ اُس مقصد کے فلاحی کاموں کے لیے وقف کر دیتی تھیں۔ اس طرح انھوں نے کروڑوں روپے نیک کاموں میں لگائے۔ غرض سبولکشمی ہمارے ملک کی ایسی عظیم خاتون تھیں جو صرف خطاب کے اعتبار سے نہیں بلکہ اپنے کردار و گفتار، عزم، ولولے، خلوص اور خدمت گزاری کے بھرپور جذبے کی وجہ سے صحیح معنی میں بھارت رتن تھیں۔

3-5-805, Haiderguda, Hyderabad-500029

□□□

कौमी काउन्सिल बराए फरोग़–ए–उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

M/O HRD, Dept. of Secondary & Higher Education, Govt. of India, West Block-1, R.K. Puram, N.Delhi-66.

فنکشنل عربی میں قومی اردو کونسل کا دو سالہ فاصلاتی ڈپلوما

رجسٹریشن 30 اپریل 2005 تک

- روزمرہ استعمال ہونے والی عربی زبان اور عربی پڑھنے والے طالب علموں کو معاصر تقاضوں سے جوڑنے کی ایک بڑی کوشش
- باوقار روزگار کے موقعوں سے جوڑنے کے لیے اس کورس کو عربی شارٹ ہینڈ اور کمپیوٹر پیکیج سے جوڑنے کی کوشش

ڈپلوما ان فنکشنل عربک (Diploma in Functional Arabic)

اہلیت: عربی کی ابتدائی تعلیم مع قواعد۔ اس کے علاوہ عربی لکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت بھی لازمی ہے۔ عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔

فیس: طالب علم فارم اور رجسٹریشن کے لیے -/150 روپیہ یا اس کا ڈرافٹ کونسل کے مندرجہ ذیل کسی بھی اسٹڈی سینٹر میں جمع کر سکتے ہیں۔

کورس کی میعاد: دو سال۔ طالب علم ہر پانچ ماہ کے بعد اختبارات کونسل کے اسٹڈی سینٹر میں جمع کریں گے۔ **دو سال** کے اختتام پر ایک پرچہ پر مشتمل فائنل امتحان کونسل کے منظور شدہ اسٹڈی سینٹر میں کونسل کی طرف سے لیا جائے گا۔ مجموعی کامیابی کے بعد ہی کونسل کی طرف سے کامیاب طالب علم کو "Diploma in Functional Arabic" کا سرٹیفکیٹ دیا جائے گا۔

کنٹیکٹ کلاس: قومی اردو کونسل کے اسٹڈی سینٹر میں ہر ہفتہ تین کلاسیں عربی بول چال میں مہارت کی غرض سے ہوں گی جس میں طالب علم کی حاضری لازمی ہے۔

نوٹ: اسٹڈی سینٹر کے انچارج داخلہ لینے والے طالب علم کا مجموعی ڈرافٹ Director, NCPUL, New Delhi کے نام رجسٹریشن فارم کے ساتھ قومی اردو کونسل، نئی دہلی کو رجسٹرڈ پوسٹ سے ارسال کریں۔ رجسٹریشن کے بعد طالب علم کی کتابیں اسٹڈی سینٹر کو ارسال کی جائیں گی۔

کونسل کے اسٹڈی سینٹر کے نام و پتے:-

A.P:. **National Council for Promotion of Urdu Language**, (South Region Branch) 22-7-110, 3rd Floor, Sajid Yar Jung Complex (SYJ) Block No. 1 - 5, Pathar Gatti, Hyderabad,Ph. 24415194; **Idara - e - Adbiyat - e - Urdu**, Panjagutta Road, Somaji Guda, Hyderabad - 500082, Ph. 040 - 23310469; **Society for Arabic Academy** 10-3-280, Flat No. 505, Osman Plaza, Humayun Nagar,Hyderabad - 28 Ph. 23536940; **Hanafia Arabic Institute** H. No. 17-4-300, Mata Ki Khidki, Outside Dabirpura, Hyderabad - 23; **Jamiat-ul-Banaath** 16-2-874/A/2, Jeevan-Yar-Jung Colony, Sayeedabad, Hyderabad, Ph. 24550191, 24553534; **Jamia Makarim-Ul-Akhlaq** Moral Edn. & Welf. Society, Quadri Bagh, Amberpet, Hyderabad-13 Ph.27403392; **Jaysha Education Society**, Plot - 88, Road-3, West Marredpally, Secunderabad-26; **Arrahaman Education Society** Door No. 9 / 239, Lal Masjid Road, Kurnool - 518001; **Darul Uloom Niswania**, H.No. 32 / 180, Gadda Street, P. O. Kurnool, Pin. 518001 Ph. 240487, Cell. 9440551656; **Samadani Computerised Calligraphy Training Centre** 19-1-436/A / 89, Osman Bagh, Near Kamatipura Police Station, Bahadurpura, Hyderabad, Ph. 24463426; **Noble Social And Educational Society** 2-2-377A, K. V. LayoutBehind L. I. C. OfficeTirupati - 517501; **Idara Ashraful Uloom Khaja Bagh**, Near Padmavati College,Syeedabad Colony, Hyderabad - 59Ph. 040 - 24070681, 24079067

Assam:. **Institute of Oriental Studies** C/o. Shamshad Ali Bhawan, Sijubari - Dargah Road, P. O. Hathigaon Chariali, Guwahati. Ph. 0361 - 2224867, 2383050 (Off); **Model School Centre** Al-Ameen Islamic Model School, P. O. Tukrapara, Distt. Kamroop, Pin. 78113; **Abhayapuri College Centre**; Abhayapuri College P. O. Abhayapuri, Distt. Bongaigaon. Pin 783384; **Kadomoni Centre**, Kadomoni Title, Madrasa P. O. Kadomoni. Distt. Nagaon, Pin. 782122;**Islamic Study Centre**, Mangaldai College P. O. Mangaldai, Distt. Darang, Pin. 784125; **Asam Falah Society**, C/o. HOMA. Howly, P. O. Howly, Distt. Barpeta - 781316, **Sonahat Madrassa Centre**, Sonahat Sr. Madrassa, P. O. Dafarpur, Distt. Dhubri - 783334; **Nabin Chandra College**, P.O. Badarpur, Distt. Karimganj, Pin. 788806 Ph. 03845 - 268153; **Dawarus Sunnah - Zamia Madrassa** P. O. Dasgram. Distt. Karimganj. **Bihar:.** **Kainat Foundation** Kako, Jehanabad, (Bihar) - 804418 Ph. 06114 - 255314;**Imarat-e-Sharia Educational & Welfare Trust** Phulwari Sharif, Patna-801505, Ph. 0612 - 2257012, 2255581; **Banat Foundation** Jamiatul Banat, Khandail, Post. Cherki, Distt. Gaya, Pin. 824237 Ph. 0631 - 273455; **Darul Uloom Ahmadia Salafia,** Laheria Sarai, Darbhanga, **Jamia Rahmani** Khanquah, Munger; Pin 811201, Ph.06344 - 222207, **Madrasa Rahmania Gehwan** P. O. Ahilgawan, Via - Jalalgarh, Distt. Purnia; **Computerised Calligraphy Training Centre**, At. Anjuman Islamia Millat Girls High School, Pani Bagh, P. O. & Distt. Kishanganj Pin. 855107, Ph. 06456 - 233160 (O), 222502 (R); **Darul Uloom (Ahle Sunnat)Alimia Anwarul Uloom**, Damodarpur - Muzaffarpur,(Bihar)Ph. 0621 - 226012; **Darul Uloom - Ul Mashraqqia Hamidia** Madrasa Hamidia, Quilaghat, Darbhanga - 846004; **Yateem Khana - Badaria - Bettiah** Distt. West Champaran, Ph. 06254 - 232472; **Madrasa Islamia Yateem Khana Rizvia** Shaikh Mohalla,Distt. Siwan, **Madrasa Anjuman Islamia** Motihari, East Champaran; **Madrasa Islamia** Adapur, East Champaran 845001; **CRESCENT Public School** Sir Syed Nagar, Kishanganj, Pin - 855107, Ph. 06456 - 22153, 33212. **Delhi:.** **Madrsa Ibrahimia Jamiatul Quran**, Masjid Khalilullah, Batla House, Jamia Nagar, Okhla -25Mobile: 9811916009; **Madarsa Talimul Quran**, Haji Langa, Sector - 3 R.K. Puram, Ph. 011 - 26178298; **Madarsa Zinatul Quraan**, B - 291 Wecome, Seelampur, Shahdara - 53 Ph. 011 - 22828596, 22825578; **Madrasa Kifayatul Uloom Hussainia**, Gali No. 3, Near Transformer, Rajiv Gandhi Nagar, New Mustafabad - 94 Ph. 22844432, **National Arabic School** Shaheenbagh, New Delhi - 25, Ph. 55394007; **Jamia Arabia Quddusia** N - 99, Batla House, Okhla 25; **All India Talimi Wa Milli Foundation**, B -1, Raza Chowk, Opp. Street No. 18, Zakir Nagar, Jamia Nagar,Okhla-25, Ph. 011 - 55675966. **Gujarat:** **Darul Uloom Mazher-e-Saadat**, At & P.O. - Hansot, Distt. - Bharuch, Pin. 393030, Ph.02646-262050 /262031; **Shams School**, Near Industrial Post Office, Rakhial, Ahmedabad - 380028, Ph. 2749955, 2746096. **Jharkhand:.** **Madrasa Rashidul Uloom,** Lion Mohalla, Rahmat Nagar,Chatra, Pin. 825401, Ph. 06541 - 222261 (Off); **Darul Uloom Wahidia,** Mahora, Jamtara, Pin. 815351, Ph. 6175283. **J & K:.** **Fast Track Solution** 3-Khidmat Complex, The Bund,Regal Complex, Srinagar-190001; **International Computer Institute** Bapari Angan, Bohri, Kadal, Srinagar - 190002 Ph. 0194 - 2481550; **HI FI Computer Technology Institute** College Road Kupwara - 193222 Ph. 01955 - 252833 (Off), 246246 (Resi); **Darul Uloom Jamia Mahmoodia** Qasim Nagar, Mendor, Poonch - 185211 Ph. 01965 - 226171; **Shams Memorial Islamic Educational Institute**, Shamsabad, Block Khansahib Budgam, Pin. 191111 Ph. 01951 - 277269 (PP) Mob. 9419034410. **Karnataka:.** **Allama Iqbal Educational Society**, Bider, H. No. 4-1-68, Noorkhan Taleem, Bider, Ph. 230900, Mob. 08482311560; **Haleema Educational & Charitable Trust** (Regd) S.F.S. 13, Mig IInd, K. H. B. Colony, Vakkalgera, Near Bilalabad, Gulbarga - 585104; **Jamiya Sultania**, Hidayathpur Chitradurga, Pin. 577501, Ph. 2423131. **Kerala:.** **Jamia Sa-Adiya ArabiyaSa-adabad**, Deli, P.O Kalanad Kasaragod - 671317, Ph. 04994 - 237216, 238216, 23784;

Markazu Ssaquafathi Ssunniya, Karanthur, Kozhikode, Ph. 0495 - 2800121, 2800421, **Madeenathul Nnoor** College of Islamic Studies, Markaz Garden- Poonoor, P. O. Unnickulam, Kozhikode - 673574, Ph. 0495 - 2220684; **Madina Ssaquafathil Islamiyya** Swalath Nagar, Melmuri, P. O. Malappuram - 676514, Ph. 0483 - 2738343, 2731145; **Majmau Dha - A Vathil Islamiyya,** Aerocode (Regd) Malappuram, Distt. Kerala - 673639, Ph. 0483 - 2850058; **Kerala Urdu Prachara Samithi** Orphange Road, Mukkam - 673602 Calicut (Distt.) (Kerala) Ph. 0495 - 2297051 (Off) 2298437 (Resi,) Mob. 9447118437; **Kerala Urdu Prachara Samithi**, Kadameri, Calicut (Dt), Mob. 09447118437; **Kerala Urdu Prachara Samithi**, Calicut City, Calicut (Dt), Mob. 09447118437; **Kerala Urdu Prachara Samithi**, Chennamangallur, Calicut (Dt) Mob. 09447118437; **Kerala Urdu Prachara Samithi**, Edavannappara Malappuram (Dt); **Kerala Urdu Prachara Samithi**, Kavannur, Malappuram (Dt), Mob. 09447118437; **Kerala Urdu Prachara Samithi**, Malappuram City, Malappuram (Dt), Mob. 09447118437; **Kerala Urdu Prachara Samithi**, Kuttiadi Calicut (Dt), Mob. 09447118437; **Kerala Urdu Prachara Samithi**, Thiroorkkad, Malappuram (Dt), Mob. 09447118437. **M.P:. Shikshodaya M. School Neemuch**,13/68, Moolchand Marg, Neemuch - 458441, Ph. 07423 - 20427; **SAIF Education Society** 1, Mirza Market, Ashta, Distt. Sehore, Ph. 07560 - 243288 (O), 245544 (School), Mob. 09893064787. **M. S.: Jamia Islamia Ishaatul Uloom**, A / P. Akkalkuwa - 425415, Distt. Nandurbar, Ph. 02567 - 252256, **Jamea Rahmania Tahfizul Quran,** Salafi Gali 3, Gandhi Nagar, Char Kop, Kandivli (West), Mumbai - 67, Ph. 022 - 28056158, 28082004; **Jamia Talimul Banat** Akbar Plots, Akot File, Akola -444003, Ph. 0224 - 2427012; **Madrasa-e-Miftahul Uloom**, 122, Bhusar Mohall, Hindustani Masjid, Bhiwandi - 421302, Distt. Thane, Ph. 230339; **Darul Qiraat Kaleemiyah**, Kakan Wadi, Kali Masjid,station Road, Aurangabad - 431005; **Salam Educational & Other Welfare Society**, Anwary House, Azizpura, Beed - 431122 Mob. 09822284303; **The Deccan Muslim Institute**, K. B. Hidayatullah Road,2390 - B New Modikhana, Pune - 411001. **Orissa:. Maulana Abul Kalam Azad Multi - Purpose College**, Sayeed Saminary Complex, Nimo Sahi, Cuttack - 753001, Ph.: 2418387. **Rajasthan:. Madrasa-e-Gabriel**, 144, Deepak Mark,Near Bachha Park, Adarsh Nagar, Jaipur - Pin. 302004, Ph. 014 - 2616183, 2078006, 2632864.**Jamea Tul Hidaya**, 1617, Khejre Ka Rasta, Near Indira Bazar Post Box No. 2, Jaipur-302001, Ph. 0141 - 2632458, 2632483; **Darul Uloom Raza-e-Mustafa**, Vigyan Nagar, Kota, Pin. 324005, Ph. 2425618, 2433739;**Maulana Abul Kalam Azad Arabic Persian Research Institute**, Tonk. **U.P:. Madarsa Ahle-Sunnat Ziyaul-Uloom**, Ittafatganj, Ambedkar Nagar - 224145. Ph. 05273 -284527; **Darul Uloom Baharshah**, 505, Kandhari Bazar, Faizabad - 224001, Ph. 05278 - 25093; **Darul Uloom Ahle Sunnat Madrasa Asharfia Misbahul Uloom**, Mubarakpur, Azamgarh -276404, Ph. 05462 -250092, 250148, **Jamia Ahsanul Banat**, Near Gokul Das College, Tawela Street, Moradabad - 244001, Ph. 591 -2470099; **Safa Shariat College**, Wadi-e-Safa, Dumariya Ganj, Siddhartha Nagar - 272189; **Al-Ameen Institute of Information Technology**, Dr. Khan's Clinic, IInd Floor, Main Bulandhshahar Road, Hapur - 245101, Ph. 0122 -2308027 ; **Madarsa Arabia Faizul Uloom**, P.O. Mohammadabad, Gohna, Distt. Mau -276403; **Muslim Kinder Garten School Society**, Shakhayya Pura, Bahraich; **Darul Uloom Makhdumiyan Arabia**, Vill. & P.O. - Wasa Dargah, Distt. - Siddharthnagar - 272105, Ph. 05541 - 254795; **Madarsa Arabia Islamia Wasiatul Uloom**, 23/25, Bakhshi Bazar,Allahabad -211003, Ph. 0532 - 2656183; **Indian Educational Society**, Sadar Bazar, Pratapgarh, Ph. 222309; **M.E.T. Public School**, Jam-e-Masjid, Sector - 8, NOIDA, Ph. 120 - 2424238, 32005437; **Darul Uloom Tajweedul Quran**, 68 - Dare Jadeed, Darul Uloom Deoband, Distt. Saharanpur, Pin. 247554, Ph. 9897077231 ; **Jamiatul Falah**, P. O. Bilariya Ganj, Distt. Azamgarh -278121; **Milli Dargah Aligarh Convent School**, Kathak Pura, Izzat Khan, Farrukhabad -209625; **Jamia Misbahul Uloom**, Chaukonia, Bharat Bhari, Siddharth Nagar -272191, Ph. 05541 - 254602, 254620; **Jamia Sufia**, Vill. Dargah Rasoolpur, Post. Kichhauchha Sharif, Distt.

Faizabad - 224155, Ph. 05274 - 276328, 277194; **Madrasa Jame-ul-Uloom Furquania**, Mestongunj, Rampur - 244901 Ph. 0595 - 2325941; **Siddiq-e-AkbarEducational & Welfare Foundation**, 457, Ali Nagar, Rai Bareli- 229001, Ph. 0535 - 221294; **Mansabiah Arabic College**, Railway Road, Meerut; **Madrasa Arabia Isha-atul Uloom**, 81/136, Coolie Bazar, Kanpur, Ph. 0512 - 2357377; **Faiz-e-Aam Muslim School**, Sheikhpur Jafar, P. O. Raunahi, Distt. Faizabad -224182, Ph. 05278 - 255314; **Computer Point**, Ali Mian Market, Rai Bareilly; Rohilkhand Gram Vikas Utthan Samiti, 773, Shahabad, Bareilly, (U. P.)Ph. 0581 - 2541125; **samaj Sewa Samiti**, Gulshaheed Old Ice Factory, Moradabad. **Jamitaul Huda Islamia**, C/o -(Huda Educational Society), Jamo Road, Jagdishpur - 227809, Distt. Sultanpur, Ph. 05361- 265016; **Darul Uloom Rahimiah**, Raghauli, Ghosi, Distt. Mau; **Jannat Nishan Computer Training College**, Peerghaib, Khokran, Moradabad -244001, Ph. 0591 - 2315287; **Nisar Higher Secondary Education**, Hunsapura, Imlibagh, Kopagunj, Mau - 275305, Ph. 0547- 2506744 (O), 2506727 (R); **MAM Institute of Information Technology**, (Gulzar-e Hussainia Educational Society), Ajrara, Distt. Meerut, Ph. 95 -12- 88023; **Muslim Social Uplift Society**, Sultan Jahan Manzil, Shamshad Market, Aligarh; **Al - Jamiatul Farooqia Information Technology Centre**, B- 18/205, Reori Talab, Varanasi -221001, Ph. 0542 -2392786, 2393325; **Darul Uloom Warsia**, Gomti Nagar, Lucknow, Ph. 0522- 2392609; **Excellent Educational & Social Society**, Near Azad Welding Works, Raje Babu Road, Bulandshahr -203001, Ph. 0091 - 5732- 27570, Fax. 009 - 5732 - 52445; **Seerat Educational Society**, 209, Near I. T. I. Opp. Railways Crossing Naya - Gaun Lahar - Gird Jhansi, Ph. 0517- 2362771; **Jawaharlal Seva Sadan Samiti**, Mauja Bajraya Kadu, Rampur - 244901; **Shaheed Ashfaqullah KhanInfotech Center**, Ahmadpur Chungi, Shahjahanpur, Ph. 05842 - 236047 M.311625; **Al - Firdaus Rahmani School**, Rahmat Nagar, Ring Road, (DUBAGGA) P. O. Kakori, Lucknow, Ph. 2246175; **Jamia Arabia Qasimul - Uloom**, Mohalla - Shekhan Nehtaur, Distt. Bijnor, Pin. 246733; **Jamia-u- Shabab - il - Islam**, 504 / 31 - B, Braulia, Tagore Marg, Lucknow - 226020, Ph. 0522 - 2740553 ; **Jamia Islamia Ma-Aariful Qur'an**, Dawoodia Qasba: Ojhari - 244242Distt. J. P. Nagar (Amroha Moradabad)

تفصیل کے لیے رابطہ قائم کریں :

ایجوکیشن سیل، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔8، ونگ نمبر۔7، آر. کے. پورم، نئی دہلی110066
فون:26109746, 26169416 فیکس : 26108159ای میل:urducoun@ndf.vsnl.net.in

□□□

نورتن کہانیاں

مصنف: محمد بخش مجور/ انتخاب: فہیم احمد

محمد بخش مجور کی کتاب "نورتن" قدیم ادب میں اہم مقام کی حامل ہے۔ نو ابواب پر مشتمل اس کتاب میں دلچسپ انداز میں سبق آموز کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔ زیر نظر انتخاب میں بچوں کی ذہنی صلاحیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کہانیوں کی زبان سہل اور عام فہم بنا دی گئی ہے تاکہ بچے انھیں بخوبی پڑھنے اور سمجھنے کے ساتھ ساتھ لطف اندوز بھی ہو سکیں۔

صفحات:192، قیمت:-/20 روپے

ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ

مصنف: اطہر پرویز

داستانیں ہمارا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ یہ جہاں ایک طرف تفریح طبع کا ذریعہ ہیں وہیں ان سے متعلقہ عہد کی جیتی جاگتی تصویر بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مافوق الفطری عناصر کی پیش کش سے قطع نظر داستانوں میں ہماری سماجی و ثقافتی تاریخ پوشیدہ ہے۔
اس کتاب میں ایسی ہی تین داستانیں شامل ہیں۔

صفحات:148، قیمت-/18 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: مدن گوپال
ترجمہ: فاخر شہیر عباسی

کشان سلطنت

جزیرہ نما ہندستان کے ایک معمولی سے حصے اور آسام کے بعض علاقوں کو چھوڑ کر، موجودہ ہندستان، پاکستان اور افغانستان کا تقریباً پورا علاقہ، اشوک اعظم کی سلطنت میں شامل تھا۔ ہندستان کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ پورے ملک میں کسی ایک راجہ کا حکم چلتا تھا اور وہ بھی ایک رسمِ خط میں، جیسا کہ چٹانوں اور لاٹوں پر کندہ فرمانوں سے اس کے ثبوت ملتے ہیں۔

اشوک اعظم کی موت کے بعد (232 ق.م.) موریہ سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔ اس کے بعد ایک ایک کرکے سات راجا تخت نشین ہوئے لیکن ان سب نے مل کر صاف پینتالیس برس حکومت کی۔ آخری موریہ راجا یونانیوں کے خلاف معمولی سی مزاحمت کرسکا تھا اور 187 ق.م. میں اس کے برہمن سپہ سالار، شنگ خاندان کے پُسیامتر نے اسے قتل کردیا۔

موریہ سلطنت اتنی عظیم الشان اور آسودہ حال تھی کہ وہ یونانی جنرلوں اور ایشیائے کوچک اور وسط ایشیا کے حکمرانوں کی لالچی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ لالچی سیلوکس کی حکومت اور پارتھیا (Parthia) اور بکٹریا (Bactria) کے فرار راجاؤں کی نگاہیں بھی اس پر لگی ہوئی تھیں جو بحر خوارزم کے جنوب اور مشرق میں اور ہندوکش پہاڑوں کے مشرق اور شمال میں موجود تھے۔ یونانی ریاستیں آپس میں ایک دوسرے سے لڑائی کر رہی تھیں۔ جب وہ لڑائی میں مصروف تھیں، اس وقت موریہ سلطنت میں امن وسکون تھا۔ حالانکہ، جب وہاں امن ہوگیا اس وقت ہندستان پر بیرونی حملے ہو رہے تھے۔ بکٹریا اور پارتھیا کے راجاؤں نے ہندستان کے اس اندرونی انتشار کا فائدہ اٹھایا۔

بکٹریائی راجہ کی پسپائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، جو اپنے گھریلو تنازعات کا خاتمہ کرنے کے لیے تیزی کے ساتھ واپس چلا گیا تھا، پُسیامتر نے ایک نئی سلطنت قائم کردی اور مزید یونانی حملوں سے مگدھ کی حفاظت کی۔ بکٹریا کے ہند یونانی راجاؤں سے پنجاب اور سندھ کو دوبارہ حاصل کرلینے کے بعد پُسیامتر نے عظیم الشان پاٹلی پتر کے کم از کم ایک حصے کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے بہت کوششیں کیں۔

حالانکہ شنگ سلطنت میں محض چند حکمراں ہی ہوئے۔ بہت کم مدت میں اس سلطنت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اب جبکہ وہاں کوئی مضبوط مرکزی انتظامیہ باقی نہیں رہ گئی تھی، راجپوتانہ کے یودھیا، شمالی ہند کے بھرسوا، وسطی ہندستان کے واک ٹک اور شمالی بہار کے لچھوی، سبھی نے اپنے اقتدار کا دعوا کیا اور غیر ملکیوں کو ہندستانی سرزمین سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی۔ وہ کچھ حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن پھر ایک نیا واقعہ رونما ہوا، جس نے نہ صرف ہندستان، بلکہ پارتھیا اور بکٹریا وغیرہ کو بھی متاثر کیا۔ جس واقعے کی طرف ہم اشارہ کررہے ہیں وہ وسطی اور جنوبی ایشیا میں ایک بڑی قبائلی تحریک تھی۔ یہ عیسوی سن کے اوائل کی بات ہے جب ممکن ہے کہ بعض ماحولیاتی تبدیلیوں کی بنا پر سخت جان منگول خانہ بدوش زورآور گھوڑوں پر سوار ہوکر شمالی ایشیا سے نکل کر مغرب اور جنوب کی آسودہ حال ریاستوں کی طرف بھاگے اور یہ صرف ایک لہر نہیں تھی بلکہ ایک طوفان تھا اور جیسا کہ رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا کہ ''کوئی نہیں جانتا تھا کہ کب اور کس کے بلانے پر انسانوں کا یہ لامتناہی قافلہ سمندر کی جانب بھاگا چلا جارہا تھا۔ آریا اور غیر آریا، دراوڑی اور چینی، سیتھین، ہُن، پٹھان اور مغل سبھی ایک دوسرے میں مل گئے تھے اور ایک جسم میں ضم ہوگئے تھے۔''

عالمی تاریخ کے اس عہد میں ہمارا سروکار صرف ان طاقتور قبیلوں سے ہے جو چین کے شمال مغربی کنارے کے میدانوں میں آباد تھے اور خونخوار اور وحشی انسانوں کے ایک جمِ غفیر کو مسلسل باہر کی طرف بھیج رہے تھے۔ یہ نقل و حرکت اتنی طاقتور تھی کہ اس کا ردِ عمل کئی صدیوں تک محسوس کیا گیا۔ مداخلت کا ایک اولین مرکز کانسو (Kansu) کا علاقہ تھا۔ اس کے مشرق میں سردریا (Jaxartersrive) کا شمالی علاقہ تھا جہاں سیتھین (Scythians) یا شاکا (Sakas) آباد تھے۔ کانسو کے یوچی (Yuchchihs) قبیلے مشرق کی طرف بڑھے اور انھوں نے شاکاؤں کو پہلے سردریا کے جنوب کی طرف اور پھر امر دریا (Oxusriver) کی طرف دھکیلا، اور شاکا جو جنوب کی طرف بڑھے انھوں نے بکٹریا کے ہند یونانیوں کو جنوب کی طرف ہندستان میں دھکیلا۔ پھر یوچی قبائل کا ایک اور ریلا آیا اور اس نے ہند یونانیوں کو مزید مغرب کی طرف کاٹھیاواڑ (Kathiawad) میں دھکا دیا۔ پھر ایک اور ریلا آیا اور اس بار خود یوچی قبائل پر ہون قبیلے نے یلغار کی اور وہ جنوب کی طرف ہندستان میں

● "Turning Points of Indian History" جناب مدن گوپال کی بے حد اہم کتاب ہے جس میں ہندستانی تاریخ کے ان پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے جنھوں نے ہندستانی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ ''اردو دنیا'' میں اس کا ترجمہ ''ہندستانی تاریخ کے اہم موڑ'' کے نام سے قسط وار شائع کیا جارہا ہے۔

داخل ہوئے، اور اب انھوں نے شاکاؤں کو مغرب کی جانب گجرات اور مغربی ہندستان اور دکن کی طرف دھکیلا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ بکٹریا کے ہند یونانیوں کے ذریعے بنائی گئی ہندستان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تقریباً دو سو برسوں تک قائم رہیں۔ طاقتور انسانی ریلے کی بنا پر بکٹریا سے ہندستان کی طرف آنے پر مجبور شاکاؤں نے پہلے شاکستھان یا موجودہ عہد کے سیستان میں قیام کیا اور بعد میں شمالی ومغربی ہندستان میں پھیل گئے، جدید ہندستان میں اکثر مقامات پر آج بھی استعمال کیے جانے والے شاکا بدا(Sakabda) سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ انھوں نے کتنا اہم رول ادا کیا تھا۔

سب سے مشہور ہند یونانی یا بکٹریائی راجا مندر (Menander) تھا جس نے پاٹلی پتر کو بھی دھمکی دی تھی۔ حالانکہ اسے زبردست شکست اور پسپائی حاصل ہوئی، لیکن اس کے باوجود بھی وہ پنجاب اور سندھ کے ایک حصے پر اپنی راجدھانی سیالکوٹ سے حکومت کرتا رہا۔ اس سے زیادہ اہم حقیقت شاید یہ ہے کہ اس نے بدھ مذہب اختیار کرلیا تھا۔ دراصل بودھ علم و دانش میں وہ ایک اہم شخصیت تسلیم کیا جاتا ہے جو اسے 'راجا ملند' کے نام سے بلاتے ہیں اور اسے بدھ بھکشوؤں اور درویشوں کے خانے میں شامل کیا جاتا ہے۔

بعد میں کسی طرح سیتھین وسطی ایشیا میں سیستان سے باہر نکال دیے گئے۔ انھوں نے پنجاب اور متھرا، راجپوتانہ، مالوا، گجرات اور مغربی دکن کے آس پاس کے علاقوں کو فتح کیا۔ 57ق.م. میں انھوں نے اجین کو بھی چیلنج کیا لیکن وکرمادتیہ نے انھیں پسپا کردیا جس نے اپنی فتح کا جشن نئے وکرم سن کے آغاز کے ذریعے منایا۔ حالانکہ شاکاؤں کو کچھ مدت کے لیے پسپا کردیا گیا تھا، لیکن اب یوچی قبیلوں نے اپنا زور بڑھانا شروع کردیا تھا اور انھوں نے اپنا اقتدار کم سے کم متھرا تک بڑھالیا تھا۔

اسی درمیان 174 ق.م. میں وسطی ایشیا کے یوچی قبیلوں کو جنھوں نے شاکاؤں کو باہر دھکیلا تھا، ہون قبیلوں نے امردریا اور سردریا کے درمیانی علاقے میں دھکیل دیا۔ ہون زیادہ وحشی ثابت ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ شکست خوردہ یوچی قبیلے کے ایک سردار کا سر فاتح ہون قبیلے کے ذریعے شراب کے پیالے کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔

خانہ بدوش یوچی قبیلوں نے ایک پرسکون زندگی اختیار کی اور وہ پانچ خودمختار ریاستوں میں تقسیم ہوگئے جس میں سے ہر ایک کا اپنا سردار تھا۔ یوچی قبیلے کی ایک ٹکڑی نے کدفسس (Kadaphises) کا تختہ پلٹتے ہوئے قندھار میں داخل ہوئے۔ ایک دوسری شاخ نے جو کشان کہلاتی تھی، یوچی کے فاتح سردار کے دوسرے چاروں قبیلوں کو تابع کرلیا۔ کدفسس نے اپنے آپ کو پانچوں قبیلوں کا سردار قرار دے دیا اور غیر اہم یونانی، پارتھین اور شاکا ریاستوں کو فتح کرلیا۔ اس درمیان کشان جنوب کی طرف بڑھے اور ایک ریاست تشکیل دی جس میں پنجاب، سندھ، شمالی گجرات اور وسطی ہندستان کے علاقے شامل تھے۔ سب سے اہم کشان راجا کنشک تھا۔ اس کی حکومت قندھار سے اودھ اور بنارس تک پھیلی ہوئی تھی۔ اجین کے شاکا گورنروں کو اپنی جاگیر میں شامل کرنے کے بعد اس نے اپنی حکومت کو گنگا کے مغرب تک اور جنوب میں نرمدا تک پھیلا دیا۔

کشان حکومت کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس کی راجدھانی پیشاور سے حکمراں نے کئی فوجی دستے بھیجے جنھوں نے کشمیر اور چینی ترکستان کے حصوں کو اپنے زیرنگیں کیا جس میں کاشغر، یارکنڈ اور ختن یعنی پامیر کے عبوری علاقے شامل تھے۔ چینیوں کو سپراندازی پر مجبور کیا گیا جو پیشاور میں بسے ہوئے تھے اور انھیں خاص مراعات حاصل تھیں۔

اس دور میں روم اور مشرق کے درمیان خشکی کے راستے سے بلخ اور بحری راستے سے مشرق وسطی و ایشیائے کوچک سے تجارت کی جاتی تھی۔ تقریبا 80ء کے آس پاس ایک اسکندری بحری کپتان کے ذریعے لکھی گئی ایک دلچسپ گائڈ کتاب "Periplus Maris Enytheri" میں گجرات اور سندھ کے ساحلوں سے مسالے اور ریشم کی تجارت کا ذکر ملتا ہے جس کے بدلے میں روم کے سونے کے سکے، یونانی شرابیں اور حرم کے لیے خوبصورت دوشیزائیں درآمد کی جاتی تھیں۔ کشانوں نے بڑے تجارتی راستوں پر خاص طور سے مغربی دنیا سے ریشم کی تجارت پر اپنا قبضہ جمارکھا تھا۔

کشان حکمراں کنشک ایک عظیم ثقافت کا شہنشاہ تھا۔ اس کی حکومت میں ہند یونانی، زرتشت، بودھ اور دوسری تہذیبوں کے لوگ رہتے تھے۔ یہ بھی ایک قابل غور بات ہے کہ یونانی، شاکا، کشان اور دوسرے غیرملکی لوگ پہلی ہی نسل میں ہندستانی ہوگئے تھے اور انھوں نے ہندستانی تہذیب کو فروغ دینے میں اپنا بھرپور تعاون دیا۔ ٹکشلا کا ایک یونانی باشندہ ہیلیوڈورس (Heliodorous) جسے شنگ راجا کاشی پور بھاگبھدر کا سفیر مقرر کیا گیا تھا، وشنو کا پرستار ہوگیا اور اس نے ایک عظیم ستون تعمیر کیا جو سانچی کے نزدیک واقع ہے۔ بعض یونانی جو ہندستانی افکار سے بے حد متاثر تھے اور اپنی ذاتی تہذیب سے مصالحت کرنے کے لیے تیار تھے، وہ مکمل طور سے ہندستانی آبادی میں ضم نہیں ہوسکے۔ پیشاور اور قندھار ثقافتی مرکز بن گئے تھے جہاں پر مختلف لوگ آکر ملتے تھے۔

یہ ریاست بے حد دولت مند اور آسودہ حال تھی۔ اس کی راجدھانی پیشاور متعدد پرشکوہ عمارتوں سے آراستہ تھی۔ ایک نشان امتیاز، جو اس وقت کی

دنیا کے عجائبات میں شمار کیا جاتا تھا وہ تھا ایک 600فٹ اونچا لکڑی کا مینار جو بدھ کے باقیات کی نشانی مانا جاتا تھا۔

یہ ایک فنکارانہ اور ادبی سرگرمیوں کا عہد تھا۔ بدھ پہلی بار انسانی وضع قطع میں ظاہر ہوا اور ہندستانی آرٹ نے یونانی تہذیب وتمدن کے اتصال سے نئی بلندیاں حاصل کیں۔ نئی ادبی ہیئتیں ظہور میں آئیں۔ ہندستان کے سبھی خطوں سے اسکالرز اس کے دربار میں پہنچنے لگے۔ ڈراما اور درباری رزمیہ نظموں کا آغاز ہوا۔ مشہور طبیب چرک کا تعلق بھی اسی عہد سے تھا۔

ایک اور عظیم شخصیت، ایودھیا کا برہمن پجاری اشوگھوش تھا، جو بودھ ہوگیا تھا۔ یہ وہی فلسفی، مصنف، ڈراما نگار اور موسیقار اشوگھوش تھا جس نے شائستہ سنسکرت زبان میں بدھ کی زندگی پر لکھی گئی اپنی تحریروں سے بدھ ازم اور ہندوازم کے درمیان تنازعے کوختم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ روایت سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ وہی اشوگھوش تھا جس کی کوششوں سے کنشک نے بدھ مذہب اختیار کیا تھا۔ کنشک کو بھی ایسا لگتا ہے کہ بدھ کے مسودات کے بعض حصوں کی متضاد تشریحات کی بنا پر کافی حیرت تھی۔ اس کے لیے اس نے پانچ سو بودھ بھکشوؤں کو چوتھی اور آخری بودھ کونسل میں حصہ لینے کی دعوت دی جو کشمیر کے کنڈل ون آشرم میں منعقد کی گئی تھی۔ اس کونسل میں جس کی صدارت پارشوناتھ نے کی تھی، اشوگھوش، ناگارجن اور وشومتر نے حصہ لیا تھا۔ اس میں پیش کیے گئے مشورے اور استدلال پر تقریباً چھ مہینے تک غوروفکر کیا جاتا رہا اور اس کونسل سے بدھ ازم کی تاریخ میں ایک نئے عہد کا آغاز مانا جاتا ہے۔ اس کونسل نے عظیم بودھ انسائیکلوپیڈیا، ''مہاوبھاس'' کے مسودات اور اس کی ترتیب وتدوین پر مفصل توضیحی تبصروں اور رائے زنی کا موقع فراہم کیا۔

کونسل کے اختتام کے بعد کی گئی بدھ ازم کی تشریحات بدھ کے اصل تصورات سے قدرے مختلف نظر آئیں۔ اس پر ہندو اور اس وقت کے شمالی ہندستان میں موجود دوسرے عقائد جیسے یونانی اور زرتشت کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔ اس عہد میں جب نوزائیدہ عیسائیت پوری طرح ابھر رہی تھی، بدھ ازم بھی ایشیا اور مصر کی اکادمیوں اور بازاروں میں پھیل رہا تھا اور اس کو ہندستانی تہذیب کی تاریخ میں کافی اہمیت حاصل تھی۔ دونوں مذاہب اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی مظاہر پرستی اور آرٹ کے بیش بہا کاموں سے متاثر ہوئے جس نے اصنام پرستی کی بہت سی شکلوں کو جنم دیا۔ بدھ ازم زندگی کے ایک اعلا منفرد فلسفے سے ایک عالمی مذہب میں تبدیل ہوگیا اور ختن کے راستے، جہاں ہندستان اور چین کی سرحدیں ملتی ہیں، وسطی ایشیا کے تجارتی راستوں تک اور پھر چین تک پھیل گیا۔

355, Jhelum Hostel, JNU, New Delhi-67

□□□

فارم IV

(حسب قاعدہ) بابت ''اردو دنیا''، نئی دہلی

(1) مقام اشاعت : ویسٹ بلاک۔1، آر.کے.پورم، نئی دہلی-110066

(2) وقفہ اشاعت : ماہنامہ

(3) پرنٹر و پبلشر کا نام : ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

قومیت : ہندستانی

پتا : ویسٹ بلاک-1، آر.کے.پورم، نئی دہلی-110066

(4) ایڈیٹر کا نام : ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

قومیت : ہندستانی

پتا : ویسٹ بلاک-1، آر.کے.پورم، نئی دہلی-110066

(5) مالک : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر.کے.پورم، نئی دہلی-110066

میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم ویقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط

محمد حمید اللہ بھٹ

رفعت سروش

جذبی کی یاد میں

دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں اب دنیا دنیا کون کرے

یہ اس شاعر کا شعر ہے جس نے ابھی چند روز پہلے 93 برس کی عمر میں زندگی کو الوداع کہا اور اس سرائے فانی کی فضا میں آخری سانس لی۔ مگر اسے زندگی کی تلخیوں نے اس قدر دل برداشتہ کر دیا تھا کہ وہ اپنے عالم شباب میں بھی دنیا سے بیزاری کا اظہار کر چکا تھا اور یہ شعر معین احسن جذبی نے آخری عمر میں نہیں بلکہ 1933 میں کہا تھا۔ آج سے بہتر سال پہلے۔ یعنی اکیس سال کی عمر میں اور یہ شعر!! (جذبی کا سنہ پیدائش 1912 ہے۔) جذبی طبیعتاً غم پسند ہوں، ایسا بھی نہیں ہے۔ ان کے یہاں زندگی کی رنگارنگی، گہما گہمی، سماجی اور سیاسی تنقید، ہوش مندی اور جوش و خروش، سبھی کچھ ہے مگر حد اعتدال کے ساتھ۔ یہ اعتدال ان کی قوت بھی تھی اور کمزوری بھی۔ کمزوری ان معنوں میں کہ وہ 1947 کے بعد اپنے گرم مزاج ترقی پسند ساتھیوں کی ہاں میں ہاں نہ ملا سکے اور انھوں نے انھیں اُس وقت کے مرکزی دھارے سے الگ پھینک دیا اور آہستہ آہستہ وہ اپنی زندگی کے دائرے میں ہی سکڑ کر رہ گئے۔ اب وقت کب ''دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی'' کرے گا، یہ کون جانے۔ دورِ حاضر نے تو یہ دیکھا کہ جذبی تقریباً نصف صدی سے گوشہ نشیں تھے اور اپنے اس شعر کی تصویر بن چکے تھے جس کا ذکر اوپر آیا۔

جس وقت میں نے ہوش سنبھالا اس وقت جدید اردو تنقید میں تین ناموں کی ایک مثلث ہر جگہ نظر آتی تھی۔ مجاز، جذبی اور جانثار اختر۔ تینوں اپنے اپنے رنگ میں منفرد۔ تینوں کی مقبولیت یکساں اور تینوں کا ترنم بھی الگ الگ مگر مشاعرہ نوازوں کا پسندیدہ۔ مجاز کا انداز رواں دواں تھا، جذبی کا انداز بیاں ٹھہرا ٹھہرا اور پرسوز، اور جاں نثار اختر کے یہاں ایک لاابالی پن تھا۔

1942 میں موسم سرما میں مرادآباد کے کسی ادارے نے ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد کیا تھا جسے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے براہِ راست نشر کیا گیا تھا۔ اس وقت وہاں پروگرام ایگزیکٹیو تھے ن.م. راشد۔ وہ پہلا مشاعرہ تھا جو میں نے ریڈیو پر سنا۔ اس مشاعرے میں ان تینوں شعرا کے علاوہ اس وقت کے سینیر شعرا جوش، جگر، ساغر وغیرہ تو تھے ہی، جدید شعرا میراجی اور اختر الایمان کو بھی شریک مشاعرہ کیا گیا تھا اور بعد میں سننے میں یہ آیا تھا کہ راشد نے ان دونوں ''ریڈیو کے اسٹاف آرٹسٹ شاعروں'' کی شمولیت کی شرط لگائی تھی، ریلے پروگرام کے لیے۔ بہرحال اس مشاعرے میں میں نے جذبی کی زبانی ان کی نظم ''آزار'' سنی۔

کیا خبر تھی یہ ترے پھول سے بھی نازک ہونٹ
زہر میں ڈوبیں گے، کمھلائیں گے، مرجھائیں گے

وہ میرا پہلا تعارف تھا جذبی سے، غائبانہ۔ اتفاق سے چھ سات ماہ بعد ہی جب میں اگست 1943 میں دہلی بہ سلسلۂ ملازمت آیا تو ہارڈنگ لائبریری، ٹاؤن ہال، دہلی کی ایک شعری نشست میں مجھے بھی بہ توسط تخشب جارچوی شرکت اور شعرخوانی کا موقع ملا اور وہیں جذبی سے ملاقات ہوئی۔ کم سخن، اپنی سوچ میں ڈوبا ہوا، سر پر بال کم کم، قدرے لمبوترا چہرہ، شیروانی میں ملبوس، گندمی رنگ کا نوجوان۔ جذبی مجھ سے بارہ سال بڑے تھے اور ہمیشہ لیے دیے رہتے تھے۔ عام آدمی کو تو خاطر ہی میں نہیں لاتے تھے اور اس وقت میں کیا اور میری اوقات کیا۔ آداب وسلام کے علاوہ اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ وہ رسالہ ''آج کل'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ قرول باغ میں رہتے تھے، انھی دنوں کا ایک واقعہ اختر الایمان نے سنایا تھا کہ وہ اپنی نئی نئی نظمیں سنانے جذبی کے گھر پہنچے۔ کئی نظمیں سنائیں۔ جذبی خاموشی سے سنتے رہے۔ پھر بولے۔ ''بھئی اپنی کوئی نظم سناؤ۔ یہ تو تم میری اور مجاز کی نظموں کے چربے سنا رہے ہو۔'' تو تیس سال کی عمر میں جذبی کے طنطنے کا یہ عالم تھا۔ اگست 1943 کی اس شام کے بعد اسی دلّی میں رہتے ہوئے جذبی سے بہت دن تک ملاقات نہیں ہوئی۔ تقریباً ڈیڑھ سال بعد 1944 کے دسمبر کے آخری ہفتے میں مجھے نہال سیوہاروی کے ساتھ مجاز کے یہاں ایک دعوت میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ وہ دعوت ساغر نظامی اور ان کی بیگم کے اعزاز میں تھی جو پونا سے آئے تھے۔ اور اس میں جذبی بھی شریک تھے۔ کل چھ آدمی تھے۔ شراب وشعر کی یہ محفل نصف شب تک چلی۔ جذبی بڑے خشوع وخضوع سے پی رہے تھے۔ بے تکلف محفل میں بھی مسکراتے زیادہ تھے اور ہنستے کم تھے۔ البتہ مجاز اور ساغر ہر پیگ کے بعد اور کھل جاتے تھے۔ محفل برخاست ہوئی۔ ساغر تو کورونیشن ہوٹل فتحپوری میں قیام پذیر تھے۔ مجاز تو رہتے ہی تھے اپنے ایک دوست کے ڈرائنگ روم (چاندنی چوک) میں۔ جذبی، نہال سیوہاروی اور میں پیدل چلتے

ہوئے اردو بازار آئے۔ میرا کمرہ گلی خانخاناں میں تھا۔ جذبی میری قیام گاہ پر رک گئے اور نہال اپنے گھر پٹودی ہاؤس چلے گئے۔ گویا اس رات جذبی سے ملاقات ہوئی۔ باتیں ہوئیں اور مجھے اس شاعر کو ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور پھر مجاز سے تو بہت زیادہ ملاقاتیں ہوئیں، مگر جذبی سے صرف دو تین بار۔ اور میں اگست 1945 میں ممبئی چلا گیا۔ جذبی بھی اسی سال ایم اے کرنے علی گڑھ چلے گئے تھے۔

ان دنوں میں نے جذبی سے پوچھا کہ کیا آپ فانی بدایونی سے زیادہ متاثر ہیں۔ جذبی نے کہا۔نہیں، مجھے جگر صاحب کا انداز زیادہ پسند ہے اور بعد میں جب میں نے ان کے مجموعۂ کلام ''فروزاں'' کا مطالعہ کیا تو محسوس ہوا کہ ان کے یہاں جگر مرادآبادی کے لہجے کی چمک ہے، خصوصاً ابتدائی غزلوں میں اور پھر تو خیر جذبی کا اپنا ہی دلگداز اور چھبیلا لہجہ سامنے آیا جس کی بُنت اور فنی نفاست کی کوئی نقل نہیں کر سکا۔

جذبی کی غزل کے سفر کا مطالعہ بہت دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ ابتدا میں ملال اور بعد میں جذبی تخلص کرنے والے اس شاعر کے کچھ اشعار اس کے ذہنی ارتقا کی خبر دیتے ہیں۔

حسن ہوں میں کہ عشق کی تصویر
بے خودی تجھ سے پوچھتا ہوں میں

(1929)

سنبھلنے دے ذرا بیتابیِ دل
نظر آتے ہیں کچھ آثارِ منزل

(1929)

تمھارے حسن کے جلووں کی شوخیاں توبہ
نظر تو آتے نہیں، دل پہ چھائے جاتے ہیں

(1930)

دلِ بیتاب کی اک اک تڑپ حشر بداماں ہے
ذرا منہ پھیر لینا رقصِ بسمل دیکھنے والے

(1930)

عیش سے کیوں خوش ہوئے، کیوں غم سے گھبرایا کیے
زندگی کیا جانے کیا تھی اور کیا سمجھا کیے

(1931)

جانے کیا تھا سوال، کیا تھا جواب
ہاں ادا کے جواب نے مارا

(1932)

اس انداز کی غزلیں کہتے کہتے جب جذبی 1933 میں یہ غزل کہتے ہیں تو گویا ان کی غزل کا قد ایک دم بلند ہو جاتا ہے۔

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، اب خواہشِ دنیا کون کرے
جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

یہ غزل جذبی کی ہی نہیں، جدید غزل کا سنگِ میل ہے، اور اس کے بعد جذبی نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ کیا کیا شعر کہے:

نہ آئے موت خدا یا تباہ حالی میں
یہ نام ہوگا غمِ روزگار سہہ نہ سکا

(1934)

انھیں تو پھونک دے اے برقِ آشیاں دشمن
جو آشیاں تری زد پر بنا نہیں سکتے

(1934)

1936 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی گئی تو اس کی تعمیر کرنے والوں میں مجاز، جذبی اور جاں نثار اختر برابر کے شریک رہے اور جذبی کے یہاں نظم گوئی کا رجحان بڑھ گیا مگر غزل ان کی محبوب صنفِ سخن رہی۔

اے موجِ بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں
کیا جانیے کب یہ پاپ کٹے کیا جانیے کب وہ دن آئے
جس دن کے لیے ہم اے جذبی کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں

(1943)

جذبی کا شمار ان ترقی پسند شعرا میں ہے جنھوں نے سیاسی دباؤ کو اپنی شاعری پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ ان کا ایک بلیغ جملہ ہے۔

''ہم میں سے اکثر ترقی پسندی کی رد میں ادب کے تقاضوں کو بھول گئے۔ چنانچہ اس دوران جو ادب پیدا ہوا ہے اسے ہم مشکل سے ادب کہہ سکتے ہیں۔'' (''فروزاں'' صفحہ-3)

جذبی کی کئی نظمیں جدید اردو نظم کا سنگِ میل ہیں۔ مثلاً موت، طوائف، آزار، نیا سورج وغیرہ۔ اس وقت ظاہر ہے کہ ان کی نظم نگاری کا جائزہ پیش کرنا مقصود نہیں ہے مگر چند اقتباسات:

اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جگالوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اک دھوم مچالوں تو چلوں

اور اک جام مئے تلخ چڑھا لوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں
''موت'' (1941)

اپنی فطرت کی بلندی پر مجھے ناز ہے کب
ہاں تری پست نگاہی سے گلہ ہے مجھ کو
تو گرا دے گی مجھے اپنی نظر سے ورنہ
تیرے قدموں پہ تو سجدہ بھی روا ہے مجھ کو
''طوائف'' (1941)

اب میں ایک نازک بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ جذبی کا ایک نقطۂ نظر تھا اور اس پر وہ سختی سے قائم رہے۔ ان کا بیان ہے'' سیاست میں مصلحت کو بہت دخل ہے۔ لیکن مصلحت پر شعر کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ مصلحت جزوی صداقت ہوتی ہے، شاعری کامل صداقت ہوتی ہے۔'' اور اپنے اس خیال کو واضح کرتے ہوئے جذبی نے ''فروزاں'' کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچے میں لکھا ہے'' جب ہندستان آزاد ہوا تھا اس وقت بہت سے شاعروں نے اپنی جماعت کی پالیسی کے مطابق آزادی کی مدح میں نظمیں لکھیں، لیکن چند ماہ بعد جب ان کی جماعت کی پالیسی میں تبدیلی ہوئی تو یہی شاعر ''فریب آزادی'' کے عنوان سے نظمیں لکھنے لگے۔'' (اقتباس: چند باتیں) اب اہلِ نظر کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ'' فریب آزادی'' کے ذکر سے جذبی کا اشارہ کس شاعر کی طرف ہے۔ اس میانہ روی کا خمیازہ جذبی کو بھگتنا پڑا اور وہ اپنے دائرے میں سمٹ کر رہ گئے۔

دہلی سے جانے کے بعد ایک طویل عرصے تک میری جذبی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ مگر جب میرا تبادلہ ممبئی سے دہلی ہوگیا تو ملاقاتوں کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ ناقدریٔ زمانہ نے اس شخص کے ذہن میں اس تاثر کو اور گہرا کردیا تھا۔

دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی
ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو

وہ میرے اردو مجلس کے پروگراموں میں ریکارڈنگ کے لیے آتے تھے، مگر کم کم اور شاعروں کی دنیا سے تو جیسے بے تعلق ہوگئے تھے۔ علی گڑھ کے تعلق سے ان کے جن قدرداں شاگردوں کے نام مجھے یاد آتے ہیں وہ ہیں انور صدیقی، ابن فرید، پروفیسر آفاق احمد، پروفیسر نصیر احمد خاں۔ تقریباً دس سال قبل ابن فرید نے کسی رسالے کا جذبی نمبر شائع کرنے کا پروگرام بنایا۔ مجھ سے کہا تو میں نے ایک طویل مضمون جذبی پر لکھا، مگر وہ نمبر شائع نہیں ہوا۔ پھر مدھیہ پردیش حکومت نے اقبال سمان کی جیوری میں مجھے بھی بلایا تو میں نے جذبی صاحب کا نام پیش کیا، حالانکہ مجروح سلطانپوری کسی اور کا نام پیش کرنے والے تھے۔ گفتگو کے دوران مجروح نے بہرحال سچ بات کہی کہ جذبی صاحب کو یہ انعام مجھ سے پہلے ملنا چاہیے تھا— اور بالآخر اتفاق رائے سے جذبی صاحب کو اقبال سمان کے لیے نامزد کردیا گیا۔ اعلان کے بعد میں نے مبارکباد کا خط لکھا تو جواب آیا'' مجھے سب خبر ہے، میرے بارے میں مضمون لکھتے ہو اور انعام کے لیے لوگوں سے لڑتے پھرتے ہو۔'' کتنی محبت تھی اس خط میں۔

حالانکہ ان سے ملاقات کو ایک عرصہ ہوگیا تھا مگر ان کی خیرخبر ملتی رہتی تھی اور محسوس ہوتا تھا کہ ان کا سایہ سر پر ہے، ایک بزرگ دوست زندہ ہیں۔ ان کے انتقال سے ایک کبھی نہ پُر ہونے والا خلا محسوس ہونے لگا ہے۔ ایک دور کا اختتام ہوگیا۔ میرے پاس اپنے جذبات کی ترجمانی کے لیے ان کی ہی غزل کے اشعار سے بہتر الفاظ نہیں ہیں۔

بیتے ہوئے دنوں کی حلاوت کہاں سے لائیں
اک میٹھے میٹھے درد کی راحت کہاں سے لائیں
ڈھونڈیں کہاں وہ نالۂ شب تاب کا جمال
آہِ سحر گہی کی صباحت کہاں سے لائیں
سب کچھ نصیب بھی ہو تو اے شورشِ حیات
تجھ سے نظر چرانے کی ہمت کہاں سے لائیں

259-A, Pocket 1, Phase-1,
Mayur Vihar, Delhi-110091

□□□

قومی اردو کونسل نے نہ صرف حوالہ جاتی بلکہ اعلا درجات کی ضرورتوں کے مطابق درسی کتابیں شائع کی ہیں۔

طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت

تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، ونگ-6، نئی دہلی-110066

معین احسن جذبی

موت

اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جگا لوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اک دھوم مچا لوں تو چلوں
اور اک جامِ مئے تلخ چڑھا لوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں

جانے کب پی تھی ابھی تک ہے مئے غم کا خمار
دھندلا دھندلا نظر آتا ہے جہانِ بیدار
آندھیاں چلتی ہیں دنیا ہوئی جاتی ہے غبار
آنکھ تو مل لوں ذرا ہوش میں آ لوں تو چلوں

وہ مرا سحر وہ اعجاز کہاں ہے لانا
میری کھوئی ہوئی آواز کہاں ہے لانا
میرا ٹوٹا ہوا وہ ساز کہاں ہے لانا
اک ذرا گیت بھی اس ساز پہ گا لوں تو چلوں

میں تھکا ہارا تھا اتنے میں جو آئے بادل
کسی متوالے نے چپکے سے بڑھا دی بوتل
اُف وہ رنگین پُر اسرار خیالوں کا محل
ایسے دو چار محل اور بنا لوں تو چلوں

مجھ سے کچھ کہنے کو آئی ہے مرے دل کی جلن
کیا کیا میں نے زمانے میں نہیں جس کا چلن
آنسوؤں تم نے تو بیکار بھگویا دامن
اپنے بھیگے ہوئے دامن کو سکھا لوں تو چلوں

میری آنکھوں میں ابھی تک ہے محبت کا غرور
میرے ہونٹوں کو ابھی تک ہے صداقت کا غرور
میرے ماتھے پہ ابھی تک ہے شرافت کا غرور
ایسے وہموں سے بھی اب خود کو نکالوں تو چلوں

غزل

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہشِ دنیا کون کرے
جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے
وعدے کی وفا تم سے نہ ہوئی گو جان پہ میرے بن ہی گئی
گر جھوٹا ہوں جھوٹا ہی سہی، اب تم کو جھوٹا کون کرے
ہاں وادیٔ ایمن بھی ہے وہی ہاں برق کا مسکن بھی ہے وہی
اور ہوش کا خرمن بھی ہے وہی پر ان سے تقاضا کون کرے
جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے
دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں اب دنیا دنیا کون کرے

□□□

دل کی گیتا

مدوّن: مخمور سعیدی

''شریمد بھگوت گیتا'' ہندستان کا وہ الہامی صحیفہ ہے جس کے ترجمے دنیا کی کئی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ اردو میں بھی اس کے تراجم ہوتے رہے ہیں لیکن خواجہ دل محمد کا یہ ترجمہ گیتا کا بہترین ترجمہ ہے جو اردو نظم میں کیا گیا ہے۔ ترجمے میں بہت سے مقامات پر کثیر المعانی الفاظ آئے ہیں، خواجہ صاحب نے ایسے تمام مقامات پر حاشیے میں وہ معنی درج کر دیے ہیں جو وہاں مطلوب ہیں۔ جہاں جہاں ضروری سمجھا ہے حواشی میں مطالب کی تفسیر و توضیح بھی کرتے گئے ہیں۔

صفحات: 240، قیمت: -/92 روپے

کلیاتِ سراج

سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی اردو کے کلاسیکل شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ دیباچے میں ان کی شاعرانہ خصوصیات اور ان کے شخصی اوصاف کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 732، قیمت: 138 روپے

تحریر: عابد سُورتی
ترجمہ: خورشید عالم

دہشت زدہ

جب ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے پانچ منزلہ مکان میں رہنے والے منتری رام پرساد جی کے لیے سرکار حفاظتی انتظامات کرنے والی ہے۔ ہم خوش ہوئے اور سب سے زیادہ خوشی مجھے خود ہوئی۔

ہماری رہائش گراؤنڈ فلور پر ہونے کی وجہ سے کوئی بھی پیکڑ ہماری باؤنڈری پر چڑھ کر لیٹ جاتا، تو کبھی کوئی اُچکا جوتے یا چپّل جیسی چھوٹی موٹی چیزیں اٹھا کر چلتا بنتا تھا۔ حالانکہ یہ کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ چوری چکاری کے ایسے معمولی واقعات سال بھر میں شاید ہی ہوتے، پھر بھی منتری جی کی بدولت ہماری گوروکل سوسائٹی بالکل محفوظ ہو جائے، یہ کون نہیں چاہے گا؟

ہمارے گھر میں مجھے چھوڑ کر چار افراد ہیں۔ میرے شوہر اور تین بچے۔ ایک بیٹا جو میری کوکھ سے پیدا ہوا ہے، اس کا نام ہم نے آکاش رکھا ہے، جبکہ دوسری میرے شوہر کی دو پالتو بلیاں ہیں۔ ان میں سے ایک کو وہ 'ماں حوا' کہہ کر پکارتے ہیں تو دوسری کو 'ماں سیتا' ان انوکھے ناموں سے آپ نے یہ مان لیا ہوگا کہ میرے شوہر دانشور ہیں، تو وہ بھی غلط نہیں۔

وہ کارٹونسٹ ہیں، مزاجاً بچوں سے بھی زیادہ معصوم، سارا دن اپنی دُھن میں مست رہنے کے باوجود صبح شام بلیوں کو دو بار دودھ پلانا کبھی نہیں بھولتے۔

ماں حوا سارے محلے کا جائزہ لے کر ہماری گوروکل سوسائٹی کے احاطے میں داخل ہوتی ہے، تب وہ اپنی گردن اٹھا کر بہ آوازِ بلند میرے شوہر کو اطلاع دیتی ہے۔ خبردار۔ میں آگئی ہوں۔ یہ سن کر نہ جانے کہاں سے ماں سیتا نمودار ہو کر دودھ پینے اوٹلے پر حاضر ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں کو کٹوریوں سے ساتھ ساتھ دودھ پیتے دیکھنا بھی باعثِ مسرت ہے۔

آپ کو جان کر حیرانی ہوگی کہ مزاجاً یہ دونوں بلیاں بالکل مختلف ہیں۔ پہلی دیکھنے میں شیر کے بچے جیسی ہے، جبکہ دوسری خرگوش جیسی سفید۔ ایک گوشت خور ہے تو دوسری سبزی خور۔

ہماری سوسائٹی کے کرایے دار بھی دو حصوں میں منقسم ہیں۔ ہم ساتوک بھوجن لینے والے جین ہیں، تو سوسائٹی کے سکریٹری عیسائی۔ چوتھی منزل پر پارسی اور مارواڑی خاندان بستے ہیں، تو پہلی منزل پر مسلمان اور سندھی۔

اس طرح پنچ رنگی ہوتے ہوئے بھی ہم کرایے داروں کے درمیان جو ایکتا ہے وہ دیکھ کر کسی بھی کٹر پنتھی کو جلن ہو سکتی ہے اور اب تو اس کے لیے آس پاس کی سوسائٹیوں کے لوگوں کو بھی وجہ مل گئی۔ ہمارے مکان کے نیچے چوبیس گھنٹے پولیس کا پہرہ جو بیٹھنے والا تھا۔

''مسٹر ڈیسوزا!'' بس اسٹاپ پر ہمارے سکریٹری سے ملاقات ہونے پر میں نے اُن سے جاننا چاہا: ''کیا اب ہمیں ہمارے واچ مین کی ضرورت رہتی ہے؟''

کچھ پل انھوں نے میرے سوال کو نظروں سے تول کر جواب دیا، ''ابھی پہرہ نہیں بٹھا۔'' پھر بھی میرا مشورہ انھیں معقول لگا تھا، ایسا ان کے چہرے کے تاثر سے واضح تھا۔ شاید من ہی من انھوں نے گنتی کر لی ہو، دو چوکیداروں میں سے رات کی ڈیوٹی والے ایک چوکیدار کو چھٹی دے کر سوسائٹی کے خرچ میں تھوڑی سی بچت کی جا سکتی ہے۔ ویسے بھی رات کی شفٹ والا بشن سنگھ گیارہ کے بعد مین گیٹ میں گدڑی بچھا گھوڑے بیچ کر سو جاتا تھا۔

ایک بار منتری جی نے خود اُسے دو لاتیں جما کر پھٹکارا اور اس نے پاؤں پکڑ کر فوراً معافی مانگ لی تھی، مگر اس ڈانٹ کا اُس پر زیادہ دیر تک اثر نہیں رہا۔ اب لگتا تھا وہ خود ہی نہیں رہے گا۔

بشن سنگھ کو اس کی بھنک لگ گئی۔ وہ محتاط ہو گیا اور اپنے فرض میں چستی برتنے لگا۔ اتنا ہی نہیں، ہماری پالتو بلیوں پر اسے محبت بھی اُمڈ آئی۔

''صاحب!''

اوٹلے پر دونوں بلیوں کو دودھ پلا کر کھڑے میرے شوہر کو خوش کرنے کے لیے اُس نے کہا، ''دیا، دھرم تو کوئی آپ سے سیکھے۔ ان لاوارث جانوروں سے اتنی محبت تو شاید بھگوان بھی نہیں کرتے ہوں گے۔''

اُس کے الفاظ کے پیچھے سے اٹھتی گونج میں بخوبی سن سکتی تھی۔ دراصل وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ صاحب، میں غریب آدمی ہوں، ذرا خیال رہے، کہیں نوکری سے مجھے ہاتھ نہ دھونا پڑے۔

میرے شوہر مسکرا کر اندر چلے گئے۔ جواب میں جب وہ مسکرائیں، تب جان لو کہ انھوں نے بات پہ توجہ ہی نہیں دی۔

بشن سنگھ نے میری طرف دیکھا۔ میں ابھی بھی اوٹلے اور بیٹھک کے درمیان کھڑی اُس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ تبھی اس میں مجھے ایک چمک دکھائی دی، مانو اُسے اب سمجھ میں آیا ہو کہ روزانہ میں دفتر جاتی تھی، اس لیے گھر کی مالکن میں ہوں۔ اُسے مجھے خوش کرنا چاہیے۔

اُس کی دلیل غلط نہیں تھی۔ عملی زندگی میں میرے شوہر خائف رہتے تھے۔ شادی بیاہ کا موقع ہو یا ہماری سوسائٹی کی سالانہ میٹنگ کا، مجھے ہی جانا پڑتا تھا۔ کبھی کسی رشتے دار کی شو یاترا میں میں انھیں زبردستی بھیجتی تو وہ ہمارے بیٹے آکاش کی طرح مجھ سے روٹھ جاتے، تب ایسا لگتا، جیسے باپ بیٹے کی عمر میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔

بشن سنگھ اپنی ادھیڑ بُن سے فارغ ہو کر ہونٹ کھولے کہ اس سے قبل کسی

گاڑی کے پہیے کی چیخ سنائی دی، ڈرائیور نے اچانک بریک پر پاؤں دبایا تھا۔

میرے شوہر پھر اوٹلے پر دوڑ آئے۔ ہمارے سامنے پولیس کی ایک بند گاڑی آکر رکی تھی۔ اس کے دو ٹائروں کے درمیان ماں حوا تڑپ رہی تھی۔ اس کا سر کچل گیا تھا۔

میں نے سانس روک کر شوہر کی طرف دیکھا۔ ہماری ازدواجی زندگی کے سات برسوں میں پہلی بار ان کے چہرے پر عجیب سا تاثر دکھائی دیا، جنھیں میں پڑھ نہیں سکی۔ ان میں نہ صدمہ تھا، نہ غصہ اور نہ ہی نفرت۔ پھر بھی وہ کافی کچھ کہہ رہے تھے۔

ماں حوا کی موت کا صدمہ مانو ہمارے بیٹے کی اچانک موت کی طرح تھا، مگر انھوں نے افسوس نہیں جتایا، بلکہ وہ ہنسنے لگے۔ پھر میری کلائی تھام کر وہ مجھے اندر لے آئے اور جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، اور مجھے بغل میں کھڑی چھوڑ کر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

وہ اپنا ڈرائنگ بورڈ میز کے سہارے ٹکا کر کرسی پر بیٹھے تھے۔ میں غور سے انھیں کارٹون بناتے ہوئے دیکھتی رہی۔ انھوں نے ایک الیکٹرک چیئر کا خاکہ بنایا تھا۔ جس پر سزائے موت کا قیدی بیٹھنے جارہا تھا، مگر وہ قیدی یہ نہیں جانتا تھا کہ کسی نے اس کرسی پر ایک کیل کھڑی کر رکھی ہے۔

ان کے معصوم طنز میں تلخی شامل تھی۔ وہ تلخی زندگی کی تھی، موت کے ساتھ بھی وہ چھیڑ خوانی کرنے لگے تھے۔ ایک بے قصور جانور کے قتل کا یہ گہرا اثر تھا، اپنے برش کے ذریعے وہ احساس ہورہا تھا۔ جن محافظوں کا نیاز حاصل کرنے کی میں نے خوبصورت کلپنا کی تھی، ان کی آمد نے میرے شوہر کے دل کے کسی گمنام گوشے میں وار کیا تھا۔

یہ تو صرف آغاز تھا۔

پولیس کی گاڑی سے اترتے ہوئے پانچ باڈی گارڈ ہماری گورہ کل سوسائٹی کے احاطے میں کرسیاں ڈال کر جم گئے، جن میں دو حوالدار، دو سی آئی ڈی کے آدمی اور ایک ادھیڑ ڈپٹی تھا۔

اس ڈپٹی کا گنجا چہرہ ہندی فلموں کے ولن کی یاد دلاتا تھا۔ اس کی کنپٹی کے اوپر کے حصے میں سفید بالوں کے گچھے تھے تو ناک کے نیچے پہلوانوں جیسی نوکیلی مونچھیں تھیں۔ وہ ہنستا تو ایسا محسوس ہوتا جیسے چمبل کا کوئی ڈاکو ہنس رہا ہو۔ باقی چار کے تھوبڑے بھی کچھ خاص نہیں تھے۔

"شریمتی سشیلا جین!" میں نے اپنے آپ سے کہا، "چہروں کی خوبصورتی مس انڈیا کے انتخاب میں دیکھی جاتی ہے، پولیس کے محکمے میں نہیں۔"

محافظ کا کام دہشت گردوں کے غیر متوقع حملے سے دوسری منزل پر رہنے والے منتری جی کو محفوظ رکھنا تھا اور دہشت گرد کب، کس جگہ، کسے اڑا دیں، یہ کوئی طے نہیں تھا۔

منتری جی سکریٹریٹ جاتے، تب پولیس کی بلیٹ پروف گاڑی انھیں لینے آتی اور شام کو صحیح سالم انھیں چھوڑ جاتی۔ تب صرف ایک حوالدار جمائیاں لیتے ہوئے مکان کے داخلے پر خاموش بیٹھا رہتا۔

میں تیار ہو کر دفتر جانے کے لیے نکلی تو میرے شوہر نے مجھے روکتے ہوئے پوچھا، "وہ لوگ یہاں کتنے دن رکنے والے ہیں؟" مجھے حیرانی ہوئی۔ پولیس کا پہرہ بیٹھے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے، اور وہ دن گننے لگے تھے۔

"شاید ایک یا دو مہینے۔" کچھ پل سوچ کر میں نے انھیں جواب دیا۔ ممبئی میں ہوئے بم دھماکوں کی دہشت کم ہونے میں اتنا وقت لگے گا، ایسا میرا قیاس تھا۔ "حالات معمول پر آنے پر سرکار انھیں واپس بلا لے گی۔"

دفتر پہنچ کر اپنے کیبن میں تنہا بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا، ایسے معمولی سوال کرنا میرے شوہر کے مزاج میں نہ تھا۔ گھر پر وہ اتنا کم بولتے تھے، کہ کبھی کبھی مجھے دھوکہ ہوتا، جیسے میں کسی مرد سے نہیں، پیڑ سے بیاہی گئی ہوں۔

ہم میں فرق صرف اتنا ہے، میں تنہا، سنجیدہ ہوں، اور وہ درخت کی طرح ہمیشہ زندہ جاوید ہے۔ وہ لہراتے ہوا کے جھونکوں میں ڈولنا اور پروائی میں گنگنانا جانتا ہے۔ پرندوں کو اپنے آنچل میں چھپا کر بات کرنا تو کوئی ان سے سیکھے۔

میرے شوہر مزاجاً خاموش طبیعت کے مالک تھے۔ ان کی زندگی مکمل تھی۔ میں انھیں بے لوث چاہتی ہوں، اسی وجہ سے مجھے ان کی فکر بھی رہتی ہے۔

وہ سارا دن گھر پر رہتے، موڈ ہونے پر کام کرتے ورنہ لیٹے ہوئے شاستری سنگیت یا غزلوں کا کیسیٹ سنتے۔ کبھی جی میں آتا تو وہ پل بیٹے سے چہل کر لیتے نہیں تو ماں سیتا بلی کو ڈھونڈ اسے چھیڑتے۔

ان کی آمدنی گھر گرہستی کے لیے کافی نہیں تھی۔ میں نے خود اپنی مرضی سے ایک ویڈیو کمپنی میں سیلز منیجر کی نوکری قبول کی تھی۔ دن میں گھر والوں سے میرا کوئی تعلق نہیں رہ پاتا تھا۔ یہاں میں اپنے کام میں اس قدر مصروف ہو جاتی تھی کہ گھر یادوں کے پردے سے الگ بھگ مٹ جاتا تھا۔

آج کی بات اور تھی۔ آج کے ان کے سوال پر سنجیدگی سے غور کرنے پر میں اتنا اندازہ لگا سکی کہ گھر کا ماحول شاید اب پہلے جیسا شانت نہیں ہوگا۔

میرا اندیشہ بالکل صحیح نکلا۔ چھٹی کے دن میں نے خود محسوس کیا۔ مکان کے مین گیٹ پر بیٹھ کر پانچوں محافظ سارا دن تاش کھیلتے اور تمباکو والے پان کھا کر یہاں وہاں پیک اڑاتے۔

ہنسی مذاق کا یہ سلسلہ میرے لیے بھی گھناؤنا تھا۔ ہماری رہائش گراؤنڈ فلور پر اور مین گیٹ کے قریب ہونے کی وجہ سے ہم ان کے قہقہے اور باتیں واضح طور پر سن سکتے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو گالی بکنے کی عادت تھی۔

جھرنے کی طرح مسلسل بہتی زندگی میں میں نے پہلی بار بہاؤ کو رخ بدلتے دیکھا۔ اپنے ہی گھر میں اب مجھے منہ کھولنے سے پہلے سوچنا پڑتا۔ جیسے

دیوار کے اُس پار کی باتیں ہم سن سکتے تھے، اس پار کی ہماری ذاتی گفتگو وہ لوگ بھی یقیناً سن سکتے ہوں گے۔

میں پریشان ہو اٹھی۔ کسی طرح مہینہ بیت گیا۔ اس مہینے چونکا دینے والے دو واقعے ہوئے۔

دسمبر 1992 میں بابری مسجد کی شہادت کے بعد یہاں کے مسلمان سڑکوں پر اُتر آئے تھے۔ سرکاری املاک کو نقصان پہنچایا، آگ زنی کی، آخرکار اس غم و غصے نے فرقہ وارانہ فساد کی شکل اختیار کر لی تھی۔

کچھ ہفتے بعد ہند کٹر پنتھیوں نے خوف اور دہشت کا ماحول منظم طریقے سے پیدا کر کے مسلم فرقے کو ممبئی شہر سے اکھاڑ پھینکنے کی زبردست کوشش کی۔ اس میں مسلمانوں کو جانی نقصان کے ساتھ ساتھ کروڑوں کا مالی نقصان بھی ہوا۔

اس کا بدلہ مسلم کٹر پنتھیوں نے ایک ہی دن، ایک ساتھ کیے گئے بم دھماکوں سے لیا۔ اس دن سارے ملک میں کہرام مچ گیا۔ ہند کٹر پنتھی محتاط ہو گئے۔

میں نے سوچا دونوں طرف حساب برابر ہو گیا۔ ایک آدھ ماہ میں حالات نارمل ہو جائیں گے اور وقت کے ساتھ زخم بھی بھر جائیں گے۔ میری یہ دلیل غلط ثابت ہوئی۔

ایک کے بعد ایک تین کٹر پنتھی نیتاؤں کا قتل ہوا تھا، جس میں دو ہندو تھے اور تیسرا مسلمان۔ چھوٹے موٹے بم دھماکوں کے حادثات اب عام ہو گئے تھے۔ ہمارے مکان سے پہرہ اٹھنے کی امیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔

دوسرا واقعہ ہمارے گھر میں ہی ہوا۔ ہمارا بیٹا آکاش جو اس سال کے۔جی۔ سے اوّل جماعت میں گیا تھا، اسے دفتر سے آکر میں ہوم ورک کرانے بیٹھی۔ اس کی یادداشت تھوڑی کمزور ہونے کی وجہ سے ایک نظم پانچ بار یاد کرانے کے باوجود وہ الفاظ کے تلفظ بھول جاتا تھا۔

میرے شوہر کو مذاق سوجھا۔ ماں سیتا سے کھیلتے ہوئے انھوں نے چاک مٹی سے زمین پر آکاش کا کارٹون بنایا، مگر کان لگائے گدھے کے۔

آکاش ویسے ہی پریشان تھا، وہ اور بھنّا گیا۔ غصے سے آگ بگولہ ہو کر اُس نے اپنے پاپا کو بہن کی گالی دی۔ بیوی، شوہر ہم دونوں بھونچکے رہ گئے۔

منتری جی کے باڈی گارڈ باہر تھے۔ مجھے لگا وہ ہمارے گھر میں موجود تھے۔ دھند کی طرح ہمارے آس پاس لہرا رہے تھے۔ زہر بن کر ہماری سانسوں میں گھل مل گئے تھے۔ ہم دونوں سہم کر رہ گئے۔

ہمارا چوکیدار بشن سنگھ چوہے سے پھر شیر بن گیا۔ اس شخص کی قسمت اچھی تھی کہ دن کی شفٹ والا واچ مین چھٹی پر چلا گیا۔ اب بشن سنگھ دن میں کام کرتا اور رات میں چاہے جب سو جاتا۔ اس میں بھلا کرایے داروں کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟

حقیقت کچھ اور تھی۔ وہ تنخواہ سوسائٹی سے لیتا، مگر خدمت پولیس والوں کی کرتا۔ اُن لوگوں کے لیے سارا دن چائے پانی کا انتظام کرنے کی ذمے داری اس کی تھی۔ اس کے بدلے وہ اسے پیسے بنانے کے نئے طریقے سکھاتے تھے۔

وہ دن پہلے کی یہ بات ہے۔ آکاش اسکول میں تھا۔ میرے شوہر پاس کے پارک میں چہل قدمی کرنے گئے تھے۔ میں وہی گالی آکاش کے منہ سے سن چکی تھی۔ اوٹلے پر نہ جاتے ہوئے میں نے دروازے کی آڑ سے نظریں پھیلائیں۔

مین گیٹ میں پرکری ڈال کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ تاش کھیلتا پہلوانوں جیسی مونچھوں والا گنجا ڈپٹی مکان کے احاطے میں گھس آئے ایک پھیری والے کو گالی سے مخاطب کر اپنے پاس بلا رہا تھا۔

شاید خوف یا کسی دوسری وجہ سے وہ پھیری والا اپنی جگہ پر کندو کی طرح کھڑا رہا۔ اس کے سر پر پلاسٹک اور اسٹیل کے برتنوں کا ایک ٹوکرا تھا۔ تاش کے کھیل میں غرق پولیس والوں کی طرف وہ ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔

گنجے ڈپٹی نے ایک پتا پھینک کھیل کو آگے بڑھاتے ہوئے اسے پھر بھدی سی گالی سنائی۔

ڈرتے ہوئے وہ مین گیٹ کے پاس آیا تو پتے رکھ کر گنجا کھڑا ہو گیا۔ پہلے اس نے پھیری والے کو ایک طمانچہ رسید کیا۔ پھر پوچھا "ماچس ہے؟"

ایک ہاتھ سے ٹوکرا سنبھالتے ہوئے اس نے فوراً اپنی بنڈی کی جیب سے ماچس نکال کر گنجے کی طرف بڑھا دی۔ اس نے بیڑی جلا کر بلا جھجک ماچس اپنی جیب میں ڈال لی۔ بیڑی کے کش لیتے ہوئے وہ پھر کھیل میں مشغول ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر انتظار کر کے پھیری والا چلا گیا۔

ہمارے واچ مین بشن سنگھ کے لیے دنوں دن ہونے والے ایسے واقعات سے کافی کچھ سیکھنے کو ملا تھا۔ پہلے ہماری سوسائٹی میں پھیری والے بے روک ٹوک آتے جاتے تھے۔ اب انھیں انٹری ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ یہ ٹیکس بھی پولیس والے جھاڑ لیتے تو کبھی ہمارا واچ مین اڑا لیتا تھا۔ مثلاً روز صبح کیلے کی ٹوکری لے کر آتے رام رکھا سے ہمارا واچ مین کیلے کا ایک گچھا جھٹک لیتا۔ ایک کیلا خود کھاتا اور باقی پولیس والوں میں بانٹ دیتا تھا۔

اس کے بعد وہ پانی چڑھانے پمپ روم میں جاتا اور ڈبل روٹی وانڈوں کے ساتھ بیکری والے قادر بھائی نمودار ہوتے۔ ان کا سواگت پولیس والے کرتے۔ اب تو انھیں مانگنا بھی نہیں پڑتا تھا۔ گوروکل سوسائٹی کا مین گیٹ چنگی ناکہ بن گیا تھا اور پھیری والے ٹیکس دے کر ہی لفٹ تک پہنچ سکتے تھے۔

ایسے گندے ماحول میں میرے نازک مزاج شوہر کو گھٹن ہو، یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ مگر وہ خاموش رہ کر سب کچھ برداشت کر لیتے۔ یہ بھی ان کا مزاج تھا۔ ناانصافیوں کی فریاد نہ کرنا ان کی فطرت تھی۔ لیکن برداشت کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے۔

ذہنی کرب کی جھلکیاں اب ان کی آنکھوں میں نظر آنے لگی تھیں۔ پہلے وہ ایک چیز کو ایک معصوم بچے کی طرح حیرانی سے دیکھتے تھے، اب جیسے بینائی

جا چکی ہو، ایسے ان کی آنکھیں خلا میں دھنسی رہتیں۔

ان کے غور وفکر میں موت نے عرب کے اونٹ کی طرح پاؤں ڈالا تھا۔ ان چند ہفتوں میں وہ اونٹ اپنی دُم کے ساتھ پورا ہی داخل ہوگیا تھا۔

آج صبح بنائی گئی طنزیہ تصویر میں انھوں نے پھر ایک بار پھانسی کے تختے پر کھڑے ایک قیدی کی تصویر کھینچی تھی۔ پشت پر اس کے دونوں ہاتھ ہتھکڑی سے بندھے تھے۔ ان ہاتھوں میں انگلیوں کے درمیان ایک سگریٹ پھنسا تھا، جیسے اُس کی آخری خواہش پوری کرنے کے لیے جیلر نے اسے ایک سگریٹ دی تھی، لیکن ....

موت کی دہلیز پر کھڑے انسان کا ایسا بے رحم طنز ان کی ناقابل برداشت صورتِ حال کا نتیجہ تھا۔ بالخصوص جس دن ہمارے آکاش نے تلملا کر برے الفاظ کہے تھے، وہ جیسے اپنے آپ میں سمٹ گئے تھے۔

ان کا ذہن کئی دھاگوں کی گتھی کی طرح تھا، جس کے ایک آدھ سرے ابھی اُن کے اپنے ہاتھ میں تھے۔ مثلاً مسلسل ذہنی اذیت برداشت کرنے کے باوجود وہ صبح شام ماں سیتا کو دودھ پلانا ہمیشہ یاد رکھتے تھے۔

ایک دن میں نے انھیں اوٹلے پر ننھی مار بلی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھا، ''ماں سیتا!'' وہ کہہ رہے تھے، ''آپ کو ماں ہونے کی کمی محسوس نہیں ہوتی؟ مجھے تو لگتا ہے جیسے کسی نے میرے کلیجے کا ٹکڑا کاٹ لیا ہو۔''

بلی اپنی زبان باہر نکال کر کٹوری سے چپ چاپ دودھ پی رہی تھی۔ تھوڑے فاصلے پر چہل قدمی کرتے اسٹین گن لیے ایک سی آئی ڈی کا جوان ان کی طرف متوجہ تھا۔ دھیرے دھیرے ڈگ بھرتا ہوا وہ ہمارے اوٹلے کے پاس آیا، تب میرے شوہر کی نگاہیں اس پر ٹھہریں۔

مانو انھوں نے کوئی آسیب دیکھا ہو، ایسے میں ماں سیتا کو اٹھا وہ ہڑبڑا کر اندر بھاگ آئے، پھر پلنگ کے نیچے دبک کر چیخنے لگے، ''بند کردو، دروازہ بند کردو۔ قاتل پھر آن پہنچا ہے۔''

ان کی یہ کیفیت دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ جو درخت ہوا کے جھونکوں میں ڈولنا جانتا تھا، جامد ہوگیا تھا پروائی میں گنگنانا وہ بھول گیا تھا۔ اب اس کی شاخیں بھی سونی پڑ گئی تھیں۔

اس قابلِ رحم کیفیت سے انھیں نکالنے کی تدبیر ڈھونڈنا ضروری تھا۔ کم از کم میں اپنی سوسائٹی کے سکریٹری کے آگے جی کھول کر اپنی پریشانی کا اظہار کرسکتی تھی۔

یہ سب کچھ سوچتی ہوئی میں ڈبل بیڈ پر لیٹی تھی کہ ہمارے دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں بیڈ روم کراس کر ڈرائنگ روم میں آئی اور دروازہ کھولا۔ گنجا ڈپٹی صرف بنیان اور پتلون میں مسکراتا ہوا میرے سامنے کھڑا تھا۔

ریڑھ کو چاٹتی ہوئی سردی کا احساس کرتے ہوئے میں یکبارگی دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے اپنے سخت چہرے کو ممکنہ حد تک ملائم بنا کر گزارش کی، ''مسز، تھوڑی برف ملے گی؟''

نہ کہنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ باورچی خانے تک جاتے ہوئے مجھے یکبارگی خیال آیا، رات کچھ اتنی گرم نہیں تھی کہ ٹھنڈا پانی پینے کی خواہش ہو۔ میں نے فرج سے ٹرے نکال کر برف کے ٹکڑے ایک پالیتھن میں انڈیل، وہ پالیتھن اسے تھمادی۔

پولیس والوں کے چہرے اتنے سخت کیوں ہوتے ہیں؟ ایک پرانے سوال نے پھر کروٹ لی۔ جواب کی تلاش میں غوطے لگاتی میں ابھی بھی دہلیز پر کھڑی تھی۔

کیا وہ پیدائشی ایسے بے رحم ہوں گے؟ یا پھر پولیس فورس میں بھرتی ہونے کے بعد، وقت کے ساتھ ان کے چہروں کی لکیریں تبدیل ہوتی رہی ہیں؟

دوسری دلیل مجھے کچھ مناسب لگی۔ یہ حقیقت ہے کہ انسانوں کے چہرے ان کے عملی ماحول کے مطابق مقررہ سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ کوئی روحانیت کی راہ پر آگے بڑھتا ہے تو اس کا نورانی چہرہ اس کی پہچان بن جاتی ہے۔ اس طرح قصائی کو بھی آپ اس کے چہرے سے پہچان سکتے ہیں۔ آئینے سے چہرے کا موازنہ روزِ ازل سے ہوتا رہا ہے۔

میں واپس اندر جاؤں اس سے پہلے میری حیرانی کے درمیان ہماری سوسائٹی کے سکریٹری ڈیسوزا میرے سامنے کھڑے تھے۔ فوراً میں نے انھیں اشارے سے اندر بلا لیا۔ میرے شوہر بیڈروم میں لیٹے ہوئے تھے۔ لہٰذا میں نے مسٹر ڈیسوزا کو ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر بٹھا کر ان کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔ اس میں تین نکتے تھے۔

ایک ماں بہن کی گالیاں بولنے کی پولیس والوں کی عادت۔ دو، ہمارے دروازے کے سامنے ان کا چہل قدمی کرنا۔ تین، رات میں دیر تک شور شرابا۔

میں نے یہ بھی بتایا کہ ان ساری حرکتوں کا اثر میرے شوہر کے ذہن پر ہو رہا ہے۔ ہمارا بیٹا اب گالیاں بکنا سیکھ گیا ہے۔ ہمارے گھر کی پرائیویسی بھی اب نہیں رہی۔

انھوں نے بتایا کہ سوسائٹی کے دوسرے کرائے داروں نے بھی اس بارے میں انھیں شکایت کی ہے۔ اتنا ہی نہیں تیسری منزل پر رہنے والی مس خورشید ایرانی نے اپنے شک کا اظہار کرتے ہوئے انھیں اطلاع دی ہے کہ یہ باڈی گارڈ کبھی بھی ان کی عزت پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔

فلموں میں ہیئر ڈریسر ہونے کی وجہ سے خورشید کا گھر لوٹنے کا وقت مقرر نہیں تھا۔ ویسے وہ مہذب خاتون تھی، مگر لڑکی چاہے کتنی سیدھی، مہذب کیوں نہ ہو، وہ فلم لائن سے وابستہ ہو تو سماج اُسے غلط نظروں سے دیکھتا ہے۔ مس خورشید کو دیر رات میں اکیلی آتے دیکھ یہ پولیس والے رال ٹپکاتے ہوں تو حیرانی نہیں، ورنہ وہ اس قدر پریشان نہ ہوتی۔

میں کانپ گئی۔ مس خورشید کے مسئلے کے مقابلے مجھے اپنی پریشانی بہت معمولی لگی۔ میں نے مسٹر ڈیسوزا سے پوچھا، ''پھر آپ نے کوئی راستہ نکالا؟''

اپنے ساتھ لائی ہوئی فائل میں سے انھوں نے ٹائپ شدہ ایک کاغذ

نکال کر میرے سامنے بڑھایا،"اسے پڑھنے سے آپ کو خیال آجائے گا۔"

میں اسے سرسری نگاہوں سے دیکھ گئی۔ بھی کرائے داروں کی طرف سے انھوں نے منتری جی کے نام ایک درخواست تیار کی تھی۔ اس میں کچھ نئے نکتے بھی شامل کیے گئے تھے۔

1 پولیس والے رات میں کبھی کبھی شراب نوشی بھی کرتے ہیں۔

2. اپنی وردی واسلحوں کا تکیہ بنا کر وہ صرف انڈرویر میں آدھی رات کے بعد مین گیٹ پر سوتے ہیں۔

3. صبح کے وقت صرف انڈرویئر پہنے ہوئے دانت صاف کرتے وہ احاطے میں ٹہلتے ہیں۔

اس خط کی ایک کاپی کمشنر کے نام بھیجی جانے والی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے گنجا ڈپٹی برف مانگنے ہمارے دروازے پر آیا تھا، اس کی وجہ اب سمجھ میں آئی۔ آج ان کا شراب پینے کا پروگرام تھا۔

مجھے سوچ میں کھوئی دیکھ مسز ڈیسوزا نے یاد دلایا،"اس کاغذ پر آپ کو بھی دستخط کرنا ہے۔"

"آف کورس!" ان سے قلم لے کر دستخط کرتے ہوئے میں نے کہا،"کیا آپ کو نہیں لگتا کہ یہ آفیشل لیٹر منتری جی کے نام بھیجنے سے قبل ہمیں خود چل کر انھیں دوستانہ طور سے بتانا چاہیے؟ آخر وہ بھی تو اس سوسائٹی کے ممبر ہیں؟"

"میں ان سے اتوار کو ملی تھی۔"

بے چین ہوکر میں بیچ میں بول اٹھی،"انھوں نے کیا کہا؟"

"یہی کہ سرکار کی طرف سے انھیں باڈی گارڈ ملے ہیں، فرشتے نہیں!" مسٹر ڈیسوزا بولے،"دوسرے یہ کہ ان بہادر سپاہیوں نے دیش کی خاطر اپنی جان داؤں پر لگائی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کل کا سورج وہ دیکھ بھی سکیں گے یا نہیں۔ بالآخر انھوں نے صاف صاف بتا دیا کہ تھوڑی بہت دشواری بھی کرائے داروں کو برداشت کرنی ہوگی۔"

"مسز جین!" تھوڑا رک کر انھوں نے اضافہ کیا،"شاید آپ نہیں جانتی ہوں گی، ہمارے منتری جی کا نام ہٹ لسٹ میں نہیں ہے۔"

اس بار میری حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ ان کی جان کا خطرہ نہ ہو تب ان حفاظتی انتظامات کے کیا معنی؟

میرے چہرے کو کھلی کتاب کی طرح پڑھتے ہوئے مسٹر ڈیسوزا نے وضاحت کی،"دراصل ان کے ہونے کو پولیس پروٹیکشن ملا تھا، انھیں نہیں۔ لہٰذا ان کا سر نیچا ہوگیا۔"

رات دیر تک میں اس بارے میں سوچتی رہی۔ باہر سے ہنسی مذاق کی آوازیں آتی رہیں۔ قہقہے گونجتے رہے۔ میرے شوہر نے جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو، ایسے وہ چونک کر بیٹھ گئے۔ میں نے ان کا سر اپنی گود میں لے کر انھیں واپس سلا دیا۔

ان کا روزمرہ کا معمول صبح اندھیرے سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ وہ سب سے پہلے جاگ کر باہر سے اخبار اور دودھ کی بوتل لیتے۔ دودھ گرم کرنے سے پہلے وہ ماں سیتا کے لیے کٹوری بھر دودھ الگ رکھ دیتے، پھر چائے کی پتیلی چولہے پر چڑھا کر اوٹلے پر دودھ کی کٹوری رکھتے اور چائے تیار ہونے پر مجھے جگاتے تھے۔

ان کی ڈیوٹی پوری ہوتی اور میری کسرت شروع۔ میں چائے پی کر آکاش کو جگاتی اسے ناشتہ دے کر جلدی جلدی تیار کرتی۔ اسکول بس ٹھیک آٹھ بجے آتی۔ آج اس معمول میں کچھ تبدیلی ہوئی تھی۔

میں اپنے آپ اُٹھ بیٹھی تھی۔ ایک لمبی انگڑائی لے کر سستی کو دور کرتے ہوئے میں نے بیڈروم کی آلارم گھڑی دیکھی۔ سات بج گئے تھے۔ اندر ہی اندر کھلبلی ہوئی۔ ایسا کیسے ہوا؟ روز صبح چھ بجے میرے بالوں میں اپنی انگلیاں پرو کر مجھے نیند سے اٹھانے والے میرے شوہر کیا آج اپنا عمل بھول گئے ہوں گے؟

میں باورچی خانے میں آئی تو گیس کے چولہے پر چائے جل کر تلے میں جا بیٹھی تھی۔ دوسرے چولھے پر دودھ کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ دودھ اُبل کر کچن پلیٹ فارم پر پھیل گیا تھا۔ جو تھوڑا بہت بچا تھا چائے کی طرح اب بھی اُبل رہا تھا۔

فوراً دونوں چولھے بند کرتے ہوئے میرے سینے میں ایک ہول سا پڑا۔ میرے شوہر کہاں ہیں؟ میں تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی اوٹلے پر آئی اور میرا دل دہل گیا۔

میرے شوہر اوٹلے پر گم صم بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے دودھ کی بھری ہوئی کٹوری تھی۔ گود میں ماں سیتا کا بے جان جسم تھا۔ اس کی موت سر پر لگی چوٹ کی وجہ سے ہوئی تھی۔

کیا کسی نے اُسے پتھر مارا ہوگا؟ رات میں شراب پی کر کسی پولیس والے نے اس پر ڈنڈے سے حملہ کیا ہوگا؟ یہ ممکن تھا۔ وہ پیتے وقت نمکین کی دو تین پلیٹیں ساتھ رکھتے تھے۔ شاید ہماری ماں سیتا نے ایک آدھ پلیٹ میں منہ مار کر اسے جوٹھا کر دیا ہو اور کسی نے غصے میں آکر ڈنڈا اچھال دیا ہو۔

علی الصبح مجھے شوہر کے پاس اداس کھڑی دیکھ گنجا ڈپٹی داتون کرتا ہوا بنیان اور نیلی دھاریوں والی چڈی میں میرے سامنے آکر مجھے ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔ میں نے آنکھیں دکھائیں۔ وہ اپنی پہلوانوں جیسی مونچھوں میں تھوڑا ہنسا اور بغیر کچھ کہے دانت صاف کرتے ہوئے احاطے میں ٹہلنے لگا۔

اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ رات میں بلی کے ذریعے منہ ماری گئی پلیٹ کسی نے ہمارے اوٹلے کے نیچے ہی اُلٹ دی تھی۔ میرا جی چاہا میں چیخوں، اپنی چیخ کے ذریعے اپنے غصے کا اظہار کروں۔

میں نے زندگی میں پہلی بار بے بسی محسوس کی۔ مگر میرے شوہر کا المیہ مجھ سے عظیم تھا۔ ماں گوا اور ماں سیتا، دہشت گردی کے ناگ نے ان کی دو اولادوں کو ڈس لیا تھا۔

F-58, Sector 40, Noida-201301

□□□

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

جامع اردو انسائیکلو پیڈیا

اہلِ اردو کے دیرینہ خوابوں کی تعبیر، جو بین الاقوامی معیار کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو میں پہلا مکمل اور بین الاقوامی معیار کا انسائیکلو پیڈیا شائع کیا ہے۔ اس کا سارا مواد بڑی دیدہ ریزی اور مشقت کے ساتھ سلیس زبان اور دلنشیں پیرایے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایسی کاوش ہے جو آئندہ کئی نسلوں کو علم و دانش سے مالا مال کرتی رہے گی۔
ادیبوں، صحافیوں، طلبہ اور علم دوست قارئین کے لیے ایک نادر تحفہ، ہر جلد اپنے آپ میں مکمل ہے۔
مکمل آٹھ جلدوں پر مشتمل، چھ جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

قیمت :-/1555 روپے

نیو ہندستانی ـــــ انگلش ڈکشنری

یہ ایس ڈبلیو فیلن کی مرتب کردہ مشہور ڈکشنری ہے جس میں اردو اور ہندی الفاظ کے معنی انگریزی میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ پہلی بار 1879 میں چھپی تھی۔ اس کی افادیت، اور اہمیت کے پیش نظر تب سے اب تک اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور آج بھی علمی حلقوں میں اس کی مانگ کم نہیں ہوئی ہے۔ صاحب فرہنگ آصفیہ سید احمد دہلوی اس ڈکشنری کی ترتیب کے دوران فیلن کے معاون کار تھے۔
قومی اردو کونسل نے اس مشہور ڈکشنری کو خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔

صفحات:1216، قیمت:-/418 روپے

تاریخ تحریکِ آزادیٔ ہند

مصنف: تاراچند

ہندستان کی تحریک آزادی کی ایک مبسوط تاریخ جو ڈاکٹر تاراچند جیسے مورخ نے قلم بند کی ہے۔ جلد اول میں یورپ میں نیشنلزم کا ارتقا، مغلیہ سلطنت کے زوال، جلد دوم میں 1857 سے لے کر 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام، جلد سوم میں 1885 سے تحریک عدم تعاون اور چوتھی جلد میں 1918 سے 1947 تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

صفحات:2728، قیمت-/794 روپے (مکمل سیٹ: چار جلدوں میں)

کلیاتِ میر (جلد اوّل)

مرتب: ظل عباس عباسی / تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ

"کلیاتِ میر" کے اس نسخے کی بنیاد ظل عباس عباسی مرحوم کے مرتب کردہ نسخے پر ہے جو پہلی بار 1968 میں شائع ہوا تھا اور چھ مکمل دیوان غزلیات پر مشتمل تھا۔ اس ایڈیشن میں کتابت اور قرأت کی وہ غلطیاں دور کر دی گئی ہیں جو متن میں رہ گئی تھیں اور وہ اشعار بھی شامل کر لیے گئے ہیں جو دوسرے معتبر ماخذ سے حاصل ہوئے ہیں۔ ابتدا میں میر کی زندگی اور شاعری پر مستند اہل قلم کی تحریریں، ان کے اہم اقتباسات بھی شامل ہیں۔ میر کے شائقین کے لیے یہ کتاب ایک گراں بہا تحفہ ہے۔

صفحات:870، قیمت-/336 روپے

جامع انگریزی اردو لغت

مرتب: کلیم الدین احمد

محققین، مترجمین، دفتری اہل کاروں، اساتذہ، قانون دانوں، اہل علم، صحافیوں، طلبہ اور عام لوگوں کی روزمرہ ضروریات کے لیے یکساں افادیت کی حامل یہ انگریزی اردو لغت ... الفاظ و اصطلاحات، معانی کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ لغت دنیا کے کسی بھی موضوع پر انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات فراہم کرتی ہے ... کی۔ اس میں تمام مروج علوم و فنون سے متعلق انگریزی اردو الفاظ و اصطلاحات کا ایک جامع ذخیرہ موجود ہے۔ محاورات اور تحریر عبارات سے مزین اپنی نوعیت کی یہ پہلی مستند و تحقیقی اور ضخیم لغت وسیع تر بنیادوں پر تیار کی گئی ہے۔

قیمت: مکمل سیٹ (حصہ اوّل تا ششم) -/3400 روپے

تاریخ ادب اردو

مرتبہ: سیدہ جعفر، گیان چند جین

پانچ جلدوں پر مشتمل اس ضخیم کتاب میں اردو ادب کے عہد اولیں کے تمام مہیا مواد کا تحقیق شدہ نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔ اردو ادب کی مختلف تاریخوں میں یہ تاریخ اپنی خصوصیات کے باوصف منفرد اہمیت کی حامل ہے۔ محققین، اساتذہ، اہل علم و قلم، طلبہ اور عام اردو داں حضرات کے لیے ایک بہترین تحفہ۔

قیمت: فی جلد 170 روپے، مکمل سیٹ (جلد اوّل تا پنجم): 850 روپے

آثار الصنادید (مکمل تین جلدوں میں)

مرتب: ڈاکٹر خلیق انجم

آثار قدیمہ ہمارا عظیم تہذیبی ورثہ ہیں جن کا تعلق کسی ایک قوم یا مذہبی فرقے سے نہیں، یہ پوری انسانیت کا اثاثہ ہیں ـــ سید احمد خاں کی اس مشہور کتاب میں دہلی کے آثار قدیمہ کے علاوہ مختلف علوم و فنون سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیتوں کا بھی ذکر ہے جس سے کتاب کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے۔ "آثار الصنادید" کا پہلا ایڈیشن 1847 میں شائع ہوا تھا، یہ تحقیقی ایڈیشن اسی پہلے ایڈیشن کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے اور گزشتہ ڈیڑھ سو برسوں کی دستبرد سے جو آثار قدیمہ محفوظ رہ گئے ہیں ان کی موجودہ حالت بھی اس میں بیان کر دی گئی ہے۔

صفحات:1138، قیمت:-/717 روپے

کلیاتِ پریم چند

مرتب: مدن گوپال

اردو فکشن کے بنیاد گزاروں میں منشی پریم چند کا نام سرِ فہرست ہے جنھوں نے ناول اور مختصر افسانے کی اصناف کو نہ صرف فروغ دیا بلکہ انھیں وقار اور اعتبار بھی بخشا۔ منشی پریم چند کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز اردو سے ہوا تھا، پھر وہ ہندی میں بھی لکھنے لگے اور وہاں بھی اپنے عہد کی سب سے بڑی ادبی شخصیت کہلائے۔ کونسل نے پریم چند کی تمام تحریریں اس کلیات میں جمع کر دی ہیں جو 24 جلدوں پر مشتمل ہے۔ 22 جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

22 جلدوں کی قیمت-/3395 روپے

نوٹ -: طالب علموں اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

کے. ایم. اشرف ہماری مطبوعات ''انقلاب اٹھارہ سو ستاون'' سے اقتباس

غالب اور بغاوت 1857

پرانے خیال کے مورخ نے غالب (مرزا اسد اللہ خاں) کا نام ایک مشہور اُردو شاعر کی حیثیت سے سنا ہوگا لیکن وہ غالب کو ایک مورخ کی حیثیت سے نہ جانتا ہوگا جسے بہادر شاہ نے سرکاری طور پر مغلیہ خاندان کی تاریخ مرتب کرنے کا کام تفویض کیا تھا۔ وہ اس حقیقت سے بھی واقف نہ ہوگا کہ اس جلیل القدر قومی شاعر نے نہ صرف باغیوں کی حکومت کے تحت دہلی میں رہنا پسند کیا بلکہ ایک روزنامچہ بعنوان ''دستنبو'' میں اُس نے اس یادگار دور کے روزمرّہ کے واقعات کو فارسی زبان میں قلم بند کیا۔[1] اُس روزنامچے میں اندراجات کا آغاز 11 مئی 1857 سے یعنی میرٹھ کے دستے کے پہنچنے کے وقت سے ہوتا ہے اور اندراجات کا سلسلہ 30 ستمبر تک چلتا ہے۔ جب برطانوی فوجی دستے دہلی میں عوامی مزاحمت پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئے۔ بعض اعتبار سے اس روزنامچے میں لکھنؤ کی شکست تک (جولائی 1857) کے واقعات کا ذکر ہے۔

یہ واضح طور پر معلوم نہیں کہ مصنف نے یہ بے نظیر دستاویز کیوں مرتب کی۔ بہرحال اس کی اشاعت انگریزوں کے دہلی پر مکمل قبضے کے بعد ہوئی۔ یہ قیاس کرنا چنداں غلط نہ ہوگا کہ اس کتابچے کے اصل متن میں صورت حال کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مناسب ترمیم کی گئی تھی۔ غالب کے موجودہ روزنامچے میں واقعات کا بیان بہت مختصر ہے لیکن بعض اہم حقائق کا ذکر تک نہیں حالانکہ وہ عوام کے علم میں تھے۔ خصوصاً بہت سے اہم اور پُرمعنی واقعات پر کم توجہ دی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو روزنامچے پر نظرِ ثانی کرنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ اُس نے اسی پر اکتفا کیا کہ بعض عبارات کو حذف کر دیا جائے اور بعض کا بعد میں خیال آنے پر اضافہ کیا گیا۔ یہ سب غالباً جان بچانے کے لیے کیا گیا ہوگا۔''[2]

داستان سرخوشی کے عالم میں شروع ہوتی ہے جب ہر طرف عوامی بغاوت زوروں پر تھی اور پہاڑی پر انگریزی فوجی دستوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مختلف سمتوں سے ہندستانی فوجیں دہلی کی جانب بڑھ رہی تھیں لیکن جوں ہی لڑائی شروع ہوئی۔ جو چار مہینے دس دن تک جاری رہی۔ مصنف کی خاموشی بڑھتی گئی اور اس نے چپ سادھ لی۔ عام کیفیت کے بیان کی چند سطروں کے بعد ہمیں یکایک بتایا جاتا ہے کہ ''کشمیری دروازے پر انگریزوں کے حملے کے مقابلے میں ہندستانی فوجوں کے لیے سوائے پسپا ہونے کے کوئی چارہ نہ رہا۔''[3] اب وہ اصل موضوع سے گریز کرتا ہے اور ملک میں تحریک مزاحمت کے چند اتفاقی مگر حقیقت افروز حوالوں کے سوا وہ زیادہ تر اپنے خانگی مسائل اور سابقہ دور میں انگریزوں کے تئیں اپنے خاندان کی خدمات کے ذکر پر متوجہ ہو جاتا ہے۔

بغاوت کی تفصیلات پر بحث سے متعلق مصنف کی خاموشی اور غیر ملکی فاتحین کے تئیں اس کی وفاداری کے دعووں کی حقیقت اور وقعت کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اگر ہم اس وحشیانہ قتلِ عام کو ملحوظ رکھیں جو اُس وقت جاری تھا۔ بغاوت میں اُس کی شرکت کے ذرہ بھر گمان پر بھی اسے یقیناً پھانسی پر چڑھا دیا جاتا۔[4] اس کے علاوہ غالب معاش کے لیے پنشن پر انحصار رکھتے تھے اور اس سے پیشتر کہ حکام اُس کی بحالی پر آمادہ ہوتے، انھیں اپنے خلوص نیت کا ثبوت بہم پہنچانا تھا۔ یہ اس شخص کے لیے اور بھی زیادہ ضروری تھا جو طبقۂ امرا سے تعلق رکھتا تھا اور دہلی کے مغل بادشاہ بہادر شاہ کا اتالیق، درباری اور ندیم رہ چکا تھا۔[5] اگرچہ وہ ہندستان میں انگریزی حکومت کے جدید تہذیبی اثرات کو سراہتے تھے لیکن انگریزوں کی جارحانہ پالیسیوں بالخصوص اودھ کے الحاق کو قبول نہ کر سکتے تھے۔[6] کچھ دیر کے بعد جب مارشل لا کی سختیوں میں ڈھیل ہوئی اور امن امان کی حالت بحال ہوئی تو غالب انگریزوں کے جور وستم کی زیادہ کھل کر مذمت کرنے لگے۔ وہ جاگیردار شرفا کی اس خام خیالی سے متفق نہ تھے کہ نئے حکمراں ان کو سیاسی اقتدار میں شریک کریں گے۔[7] انھوں نے عام طور پر اپنے باغی ساتھیوں اور شکست خوردہ طبقۂ امرا کے مصائب کے لیے کھلے بندوں ہمدردی کا اظہار کیا۔[8]

حقیقت یہ ہے کہ جب ستمبر 1857 کے وسط میں حالات دگرگوں ہوگئے تو انھوں نے اپنے بہت سے دوستوں کی طرح اپنی سلامتی کو ہر چیز پر ترجیح دی۔ اس لیے اگر انھوں نے حکام کے سامنے اپنی برئیت کی پرزور وکالت کی تو اس کے لیے انھیں قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ انھوں نے عذر پیش کیا کہ ''میرا خاندان ہمیشہ انگریزوں کا نمک حلال رہا ہے اور اسی بنا پر مجھے زندگی بھر کے لیے پنشن عطا ہوئی ہے۔ بغاوت کے ایام میں میں نے شاہ پرستوں اور باغیوں دونوں سے اپنے آپ کو سختی کے ساتھ الگ تھلگ رکھا ہے

● انقلاب 1857 ہندستانی تاریخ کا وہ واقعہ ہے جس نے نہ صرف اس ملک کی سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور ادبی زندگی پر اپنے زبردست اثرات چھوڑے بلکہ غیر ممالک میں بھی اس کی گونج سنی گئی۔ یہ ناکام جنگِ آزادی حقیقی آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور عوام کو احساس ہوا کہ انگریز ناقابلِ تسخیر نہیں ہیں۔ اس کتاب میں انقلاب 1857 سے متعلق تمام تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ پی سی جوشی کی مرتب کردہ 360صفحات کی اس کتاب کی قیمت -/75روپے ہے۔قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر اساتذہ اور طلبہ کو 40فیصد رعایت دیتی ہے۔

بلکہ درحقیقت میں اپنے مکان میں محبوس رہا ہوں۔ انگریزی فوجی دستوں کے داخل ہونے کے بعد بھی میں نے شہر میں ٹھہرنا پسند کیا حالاں کہ بہت سے رئیس اور پنشن خوار بھاگ گئے۔"[9] بغاوت میں اپنی عدم شرکت کے ثبوت میں انھوں نے ہندستان اور انگلینڈ میں اعلا حکام کی خدمت میں اپنا فارسی روزنامچہ (دستنبو) پیش کیا۔ اس کی وجوہات معلوم کرنا کچھ دشوار نہیں۔ ایہام گوئی میں استاد ہونے کے سبب یہ طرز انیسویں صدی کے مغل دربار کے اہل ادب میں مقبول تھی۔[10] وہ شعر کے معنی بیان کرتے ہوئے بھی اس کو چھپانے میں مہارت رکھتے تھے۔ اپنے طرز کلام اور مفہوم دونوں میں ایہام کو بڑھانے کے لیے اس موقع پر غالب نے فارسی زبان کی ادبی پاکیزگی کے حق میں اپنے تعصب سے فائدہ اٹھایا۔ غرض یہ کہ انھوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ ان کے روزنامچے کو خود یا اُن دوستوں کے خلاف جنھوں نے بغاوت میں نمایاں حصہ لیا ثبوت کے طور پر استعمال نہ کیا جاسکے۔"[11]

لیکن اس سے دہلی میں بغاوت سے متعلق بعض واقعات کے لیے معتبر سند اور ماخذ کی حیثیت سے دستنبو کی وقعت کم نہیں ہوتی۔ مجھے اس بات پر زور دینے کی ضرورت نہیں کہ مصنف کا شوقِ راست گوئی اور جذبۂ انسان دوستی اس کتاب کی ایسی ہی خصوصیات ہیں جیسی اس کی دوسری تصنیفات کی۔[12] ظاہری اسباب کی بنا پر واقعات کا بیان بے شک مبہم اور عمومی ہے۔ غالب اس جزوی داستان میں بھی قومی مزاحمت کی اس عظیم تحریک کی گرمجوشی سے ہمیں آگاہ کرنے اور اس میں الجھنے والی نئی سماجی قوتوں کی جھلک دکھانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ غالب کے فارسی روزنامچہ کا موجودہ نسخہ، اپنی مجبوریوں اور کمیوں کے باوجود۔ 1857 کے واقعات کے ہر ایماندار طالب علم کے لیے ایک بیش قیمت دستاویز ہے۔

اب ہم دستنبو سے کچھ اقتباسات قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کا فیصلہ ان ہی پر چھوڑتے ہیں۔

عوام کی بغاوت

شاعر منظر کے آغاز میں کسی قدر پریشان ہے: "عوام حکمرانوں کے ساتھ برسر پیکار ہیں۔ باغی سپاہی برطانوی سپہ سالاروں کا خون بہاتے ہیں اور پھر نتائج سے بے خبر ہوکر بغلیں بجاتے ہیں۔" (کلیات صفحہ 380)

حامیانِ فرنگ کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں

"چوں کہ تیز سیلاب کو خس و خاشاک سے روکنا محال ہے، اس لیے انگریزوں کے مددگاروں میں سے ہر ایک لاچار ہوگیا اور حالات کے بگڑنے پر گھر کی چاردیواری میں سوگوار ہوکر بیٹھ رہا۔ مجھے بھی ان ماتم داروں میں شمار کرلو۔" (صفحہ 382)

میرٹھ کے سواروں کا ان کے پہنچنے پر استقبال

"میرٹھ سے کچھ کینہ پرور سوار شہر میں داخل ہوئے۔ یہ سب شوروغل کرنے والے تھے جو اپنے آقاؤں کو ہلاک کرنے کے لیے بے تاب اور انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے۔ شہر کے دروازوں پر متعین دربانوں کو سازش کا پورا پورا علم تھا (لفظی معنی "ہم سوگند") انھوں نے ان ناخواندہ (یا شاید خواندہ) مہمانوں کا خیرمقدم کیا۔ بہرحال سواروں نے دربانوں کو مہمان نواز پایا۔" (ایضاً)

بغاوت کی توسیع

"رفتہ رفتہ دوردراز شہروں سے خبریں آنے لگیں کہ ہر چھاؤنی میں ہر رجمنٹ کے شوریدہ سروں نے اپنے انگریز سپہ سالاروں کو قتل کردیا ہے۔ جس طرح ساز چھڑتے ہی رقاصہ رقص میں آجاتی ہے، اسی طرح ہزاروں نمک حرام سپاہی اور کاریگر اٹھ کھڑے ہوئے اور دل و جان سے بغاوت میں شریک ہوگئے اور دوسرے سے ایک لفظ کہے بغیر اپنے اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔ ماہر جنگ سپاہیوں کے یہ بزدل دستے جھاڑو کی مانند ایک ہی شیرازے میں بندھے ہوئے ہیں۔ بے ترتیبی سے ان کے کوچ کرنے کا منظر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کسی باقاعدہ سپہ سالار کی قیادت کے بغیر لڑتے بھی ہیں۔" (ایضاً)

جاگیردار طبقہ پسِ پشت پڑ جاتا ہے

"انھوں نے نام ور اور دانش مند ہستیوں کی عزت اور انکی حویلیوں کو خاک میں ملا دیا۔ پنچ اور کنگال یکا یک ممتاز ہوگئے۔ ذرا خیال کرو یہ شہدے، لچے اب تیس مار خاں بنے ہوئے ہیں۔ یہ بدبختی کے دن ہیں جب جواں مرد خود اپنے سایے سے ڈر جاتے ہیں اور ایک معمولی سپاہی خاص و عام سب پر حکم چلاتا ہے۔" (ایضاً صفحات 85-384)

عوامی لشکر کا دہلی میں اجتماع

غالب نے لکھا ہے کہ جوں ہی سپاہیوں کے مختلف دستے دہلی میں پہنچے، سب سے پہلے انھوں نے اپنے ساتھ لایا ہوا سونا چاندی شاہی خزانے کے حوالے کردیا۔ پھر وہ لال قلعہ میں گئے تاکہ بادشاہ کے آستانے پر سجدہ کریں۔ بعد میں فوجیوں کے انداز میں اِدھر اُدھر پھرنے لگے۔

"لو دیکھو! ہر کونے کھترے سے ایک سپاہی نمودار ہوا۔ ہر راہ سے ایک پلٹن اور ہر جانب سے ایک فوج ظاہر ہوئی۔ سبھی اس سرزمین یعنی دہلی کی طرف بڑھنے لگے۔ عجیب زمانہ ہے، کامران باغیوں کے مزے ہیں۔ اب دہلی کے شہر کے اندر اور باہر کم وبیش پچاس ہزار پیادہ اور سوار فوجی جمع ہوچکے ہیں۔" (ایضاً صفحہ 385)

ہندستانی والیانِ ریاست پر عوام کا دباؤ

نامور والیِ فرخ آباد، تفضل حسین خاں نے دور ہی سے بادشاہ کے حضور میں جبہ سائی کی اور اطاعت کا اظہار کیا۔ بریلی کے خان بہادر خاں نے حضور شاہ میں ایک سو ایک سونے کی مہریں، ایک ہاتھی اور ایک گھوڑا چاندی کے ساز کے ساتھ بطور ہدیہ بھیجا۔ رام پور کے نواب یوسف علی خاں بہادر جنھوں نے مدت سے انگریز حکمرانوں کے ساتھ پیمانِ وفا باندھ رکھا تھا، بہادر شاہ سے وفاداری کا رسمی پیغام بھیجنے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح انھوں نے اپنے نکتہ چیں ہمسایوں کا منہ بند کر دیا۔ لکھنؤ میں دانش مند وزیر (لفظی معنی ''معاملہ فہم'') شرف الدولہ نے واجد علی شاہ کے بیٹوں میں سے ایک دس سال کے لڑکے کو تخت پر بٹھا دیا اور خود اُس کے پیشکار اور مشیر بن گئے۔ اُس نے دہلی میں شاہی دربار کو بیش بہا تحائف کے ساتھ اپنا سفیر بھیجا۔ الغرض بادشاہ کی قسمت کا ستارہ اتنا بلند ہوا کہ فرنگیوں (لغوی معنی خاکی وردی پہننے والوں ''خاکیوں'') کا چہرہ گہنا گیا۔'' (ایضاً صفحات 88-387)

انگریزوں کے ساتھ جنگ

''دن رات دونوں طرف سے سنگریزوں کی مانند فضا سے گولے برستے ہیں۔ مئی اور جون کی گرمی آفتاب کی تیز روشنی کے ساتھ روز بروز بڑھ رہی ہے۔ طلوعِ آفتاب کے بعد شاہی فوج کے جنگجو روزانہ شہر کے گوشے گوشے سے جمع ہوتے ہیں۔ شیروں کی مانند لڑنے جاتے ہیں اور غروبِ آفتاب سے عین پہلے واپس آجاتے ہیں۔'' (ایضاً صفحہ 386)

حویلی حکیم احسن اللہ خاں آگ کی نذر

''انھوں نے انگریزوں کے مددگار حکیم احسن خاں کی حویلی کو لوٹ لیا جو نگار خانۂ چین کی مانند نظر آتی تھی اور استقبالیہ ہال سے متصل کمرے کو آگ لگا دی۔'' (ایضاً صفحہ 387)

برطانوی حملہ اور باغیوں کی پسپائی

''14 ستمبر 1857 کو انگریزوں کا حملہ ہوا اور اب کشمیری دروازے پر برطانوی حملے کے مقابلے میں ہندستانی فوجوں (لفظی معنی ''کالے سپاہیوں'') کے لیے پسپا ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔'' (ایضاً صفحہ 388)

لوگوں کی آخری دم تک مزاحمت

''جب انگریزوں نے عوامی فوج کے ہاتھوں سے شہر چھین لیا تو عام لوگ باغی سپاہیوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور گلی گلی میں لڑنے لگے۔ شہر کے بعض شہدے، کمینے شہر پر قابض بہادر انگریز فوجیوں کے ساتھ مقابلہ کرنے لگے۔ دو تین دن تک کشمیری دروازے سے آگے شہر کا گوشہ گوشہ بیچ بیچ میدانِ جنگ بنا رہا اور باہر جانے کے تین راستے یعنی اجمیری دروازہ، ترکمان دروازہ اور دہلی دروازہ باغی فوجیوں کے ہاتھ میں رہے۔'' (ایضاً صفحہ 389)

بالآخر دہلی پر انگریزوں کے قبضے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ''اعلا اور ادنا طبقات کے بہت سے لوگ جن کا شمار ناممکن تھا، ان تین دروازوں کے ذریعے شہر سے بچ کر نکل گئے۔ (ایضاً)

لوگوں کی بلند حوصلگی

اپنے محلے میں رہنے والے شہریوں کا ذکر کرتے ہوئے غالب لکھتے ہیں: ''اگر چہ گلی کا پھاٹک بند ہے پھر بھی لوگ اس قدر بے خوف ہیں کہ وہ دروازے زبردستی سے کھول کر کھلے میدان میں نکل جاتے ہیں اور کھانے پینے کی چیزیں لے آتے ہیں۔ (ایضاً)

دیہات اور دہلی کے گردونواح میں مزاحمت

بالآخر جب 7 راکتوبر 1857 کو دہلی رسمی طور پر انگریزوں کے قبضے میں آگئی لیکن دیہات میں مزاحمت کسی صورت کم نہ ہوئی، مصنف لکھتا ہے: ''اب بھی بریلی، فرخ آباد اور لکھنؤ میں کثیر التعداد باغی منظم گروہوں کی صورت میں لڑنے اور زمین کا چپہ چپہ واپس لینے پر تلے ہوئے ہیں (لفظی معنی 'ایک ایک فرسنگ')[14] دہلی کے قرب و جوار میں سوہنہ اور نوح (ضلع گوڑگاؤں) کے میواتیوں نے ایسا اودھم مچا رکھا ہے جیسے سودائی زنجیریں توڑ کر آزاد ہو گئے ہوں۔ مثلاً رام اب بھی ریواڑی میں مفرور ہے اور دیوی نام کے میو کی فوجوں میں شامل ہو گیا ہے اور اُس کے حکم کے تحت کام کرتا ہے۔ ان پہاڑی اور جنگلی علاقوں میں یہ گروہ برطانوی حکمرانوں کے ساتھ لڑنے کا اپنا جداگانہ منصوبہ رکھتا ہے۔ الغرض یہ کہنا بجا ہوگا کہ ہندستان کا ذرّہ ذرّہ ہیجان میں مبتلا ہے۔'' (ایضاً صفحہ 397)

ایک خانگی نظارہ: بارش کے پانی کا ذخیرہ کرنا

15 ستمبر کے بعد غلّے کی تمام دکانیں بند ہو گئیں اور مہتر، دھوبی، حجام اور پھیری والے شہر چھوڑ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو دن اور دو رات کھانے پینے کا کچھ نہ ملا۔ قدرتی طور پر غالب بدحواسی کے عالم میں تھے جب ''اچانک آسمان ابر آلود ہو گیا اور بارش ہونے لگی۔ ہم نے گھر میں کپڑے کی ایک چادر پھیلائی، اس کے نیچے ایک بڑا مٹکا رکھا اور اس طرح بارش کا پانی جمع کیا۔ کہتے ہیں کہ بادل سمندر سے پانی حاصل کرتے ہیں اور زمین پر برساتے ہیں لیکن اس موقع پر یہ بیش بہا بادل ہمارے لیے چشمۂ زندگی سے پانی لائے ہیں۔ بہر حال جس آبِ حیات کو سکندر اپنی بادشاہی کے دوران ڈھونڈنے میں ناکام رہا وہ اس کھاری پانی پینے والے عاجز تشنہ لب نے مصیبت کی اس گھڑی میں دریافت کر لیا۔''[15]

غارت گری اور قتلِ عام

شہر پر برطانوی قبضے کے ساتھ بقول مصنف ''ہمارے نئے آقاؤں کی آتشِ انتقال'' کا نیا دور شروع ہوا۔'' فاتحین کشمیری دروازے کے سامنے کے راستے سے آگے بڑھے جو بازار کو جاتا ہے اور جو کوئی بھی سڑک پر ملا اُسے قتل کر ڈالا۔ ہر شریف اور ہوشمند نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر دیا۔'' (ایضاً صفحات 89-388) غالب نے لکھا کہ ''ہر طرف پھانسی کے تختے نصب ہیں اور سڑکیں دہشت ناک ہیں...... اب کسی کو باہر نکلنے اور ہم سے بات کرنے کی جرأت نہیں اور نہ ہمیں باہر جانے اور اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھنے کی مجال ہے۔''[16] (ایضاً صفحات 92-391)

جہاں تک شہر کی تاخت و تاراج کا تعلق ہے ''فوجی دستوں کے نام یہ حکم عام جاری کیا گیا ہے کہ جو شخص فوراً ہتھیار ڈال دے اس کی جان بخشی کر دی جائے لیکن اس کا مال و متاع قبضے میں لے لیا جائے۔ اگر کوئی مقابلہ کرے تو اُسے جان سے مار دیا جائے اور اس کے مال پر تصرف کر لیا جائے۔ بہر حال سارے شہر میں اتنی لاشوں کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ قتلِ عام ہوا ہے کیوں کہ ان کے کندھوں پر ان کے سر موجود نہیں ہیں۔''[17] (ایضاً صفحہ 395)

''جھجو، بہادر گڑھ، بلبھ گڑھ، لوہارو، فرخ نگر، دوجانہ اور پٹودی شہر کے گردونواح میں ایسی سات ریاستیں ہیں جن کے حکمراں دہلی میں برطانوی ایجنسی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان میں سے پانچ والیانِ ریاست کو سزا کے لیے قلعے میں نظر بند کر دیا گیا ہے اور باقی دو اپنے حشر کا بے تابی کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں۔ انھوں نے جھجو، بلبھ گڑھ اور فرخ نگر کے حکمرانوں کو الگ الگ پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا۔''[18] (ایضاً صفحات 01-400)

اس کے بعد دہلی ایک بڑا جیل خانہ نظر آنے لگا۔ بقول مصنف ''اس شہر میں جیل خانہ قصبے کی حدود سے باہر اور حوالات (دارالعزا) حدودِ شہر کے اندر ہے۔ ان دو مقامات کو لوگوں سے اس قدر کھچا کھچ بھر دیا گیا ہے گویا ایک دوسرے میں گھس کر گٹھری کی صورت بندھے ہوئے ہیں۔ صرف فرشتۂ اجل ہی جانتا ہے کہ ان دو قید خانوں میں کتنے قیدی وقتاً فوقتاً تختۂ دار پر لٹک کر مرے ہیں۔ شہر میں مسلمان باشندوں کی تعداد اس وقت ایک ہزار سے زیادہ نہیں جو یا تو قیدیوں کے رشتے دار ہیں یا پنشن خوار......'' (ایضاً صفحات 04-403)

لمحاتِ یاس اور تصورِ مستقبل

غالب اس شہر کو جسے اُس نے شہرِ خموشاں کا نام دیا، دیکھ کر شکستہ دل تھا ''ایک وقت تھا کہ وہاں ہزاروں اُس کے آشنا تھے۔ ہر گھر میں اس کا کوئی نہ کوئی رفیق اور ہر مکان میں اُس کا کوئی نہ کوئی دوست تھا۔'' یہ خیال اس کے لیے درد و کرب کا موجب تھا کہ ''شہر مسلمانوں سے خالی ہے رات کی تاریکی میں اُن کے گھر بے چراغ ہیں اور دن کو روزنِ دیوار میں سے کوئی دھواں نہیں نکلتا۔'' اس ویرانی اور ناامیدی کے عالم میں شاعر کو فقط یہی نظر آتا تھا کہ مسلمانوں کو قوم کی حیثیت سے موت اور فاقہ کشی کا سامنا ہے (ایضاً صفحہ 410) البتہ جلد ہی کہیں اُفق پر ایک دھندلا سا نقش نمودار ہوا اور شاعر نے بالآخر صوفیانہ انداز میں امید کا اظہار کیا:

چہ گر کہ ز زخمہ بر چنگ زند
پیداست کہ از بہر چہ آہنگ زند
در پردۂ ناخوشی، خوشی پنہاں است
گازر نہ زخشم جامہ برسنگ زند

(مطرب جب باجے کے تار پر مضراب لگاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ غم کے پردے میں خوشی پوشیدہ ہے۔ دھوبی کسی غصے سے کپڑے کو پتھر پر نہیں پٹکتا۔)

کتابیات

(1) دستنبو: کلیاتِ غالب (فارسی) میں شامل ہے۔ مطبوعہ لکھنؤ 1872
(2) کلیاتِ نثرِ غالب (لکھنؤ 1871)
(3) غالب کا روزنامچہ (دہلی 1924)
(4) مکاتیبِ غالب (رامپور، 1949)
(5) نادر خطوطِ غالب (لکھنؤ، 1939)
(6) عودِ ہندی (علی گڑھ، 1927)
(7) اردوئے معلّٰی (لاہور، 1922)

حواشی:

1. اپنے ایک اردو خط میں غالب لکھتے ہیں کہ جب 11 مئی کو فساد شروع ہوا تو کس طرح انھوں نے گھر کا دروازہ بند کر دیا (جو شہر کے عین وسط میں واقع تھا) اور چوں کہ ''بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی، اس نے اپنی سرگذشت جو اوروں سے سنی تھی، لکھنا شروع کر دی۔'' (عودِ ہندی صفحہ 14)
اس قسم کی عبارت ان کے روزنامچہ میں بھی موجود ہے (کلیاتِ نثرِ غالب، صفحہ 387)
2. اس کے مقدمے کے خوف کے بارے میں ملاحظہ کریں ''کلیات''
3. ایضاً صفحہ 388
4. عام طور پر یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ صرف شہر دہلی میں 27000 اشخاص کو پھانسی دی گئی یا گولی سے اڑایا گیا۔ جو لوگ قتل ہوئے اُن میں غالب کے دوست اور مشہور شاعر صہبائی کا خاندان بھی شامل تھا۔
5. مصنف اپنے روزنامچہ میں دیدہ و دانستہ بہادر شاہ اور شہزادوں سے متعلق تمام حوالوں کو حذف کر دیتا ہے (کلیات صفحہ 398)۔ جب بہادر شاہ کی جلاوطنی کی حالت میں موت کی خبر پہنچتی ہے تو اُسے غم کا احساس بھی ہوتا ہے اور اطمینان بھی۔ شاعر نے لکھا کہ ''فرشتۂ ازل نے اُسے قید فرنگ سے بھی آزاد کر دیا ہے اور قید جسم فانی سے بھی۔'' (اردوئے معلّٰی صفحات 21-120)
6. 22 فروری 1857 کے روز بغاوت سے چند ہفتے پہلے اودھ میں (غلام حسین بلگرامی

نام کے) ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے غالب لکھتا ہے: ''ان بُرے دنوں کا خیال کرو جو ہمارے مقدر میں لکھے ہیں۔ گو اس سے مجھے براہِ راست کوئی سروکار نہیں لیکن اودھ کی تباہی سے مجھے صدرد چہ صدمہ پہنچا ہے۔ درحقیقت میری رائے ہے کہ اگر کسی ہندستانی کو اودھ سے کوئی ہمدردی نہیں تو وہ انصاف سے بالکل بے بہرہ ہے۔'' (ایضاً صفحہ 403) جب اپنے روزنامچے کے اختتام پر اُسے لکھنؤ کی شکست کی روئداد قلمبند کرنی پڑتی ہے تو غالب بظاہر مغموم ہو جاتا ہے اور اس واقعے سے متعلق اظہارِ رائے میں صرف سعدی کے ایک شعر پر اکتفا کرتا ہے:

چہ کند بندہ کہ گردن نہ نہد فرماں را
چہ کند گوئے کہ تن در ندہد چوگاں را

اس کا مطلب یہ ہے کہ ''غلام کیا کرے اگر اپنے آقا کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کرے، گیند کیا کرے اگر بلّے کی ضرب بلاچون و چرا نہ سہے۔'' (کلیات صفحہ 405)

7. جب مصنف کو اطلاع ملی کہ مہاراجہ الور کے پورے اختیارات بحال کیے جا رہے ہیں تو غالب نے (جو اس زمانے کی مسئلہ جبر و قدر کی فلسفیانہ بحث میں تقدیر کی برتری کا معتقد تھا) ایک دوست کے نام خط میں طنزاً یہ کلمات لکھے: ''بالفعل تمام عالم کا ایک سا عالم ہے۔ سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجہ کو اختیار ملے گا مگر وہ اختیار ایسا ہوگا جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا، آدمی کو بدنام کیا ہے۔'' (عود ہندی صفحہ 93)

8. وضاحت کے لیے خیر آباد کے مولانا فضل حق کی مثال لیجیے جنھیں بعد میں عمر قید کی سزا دے کر انڈمان بھیجا گیا، وہیں اُن کی وفات ہوئی۔ 1861 میں جب اُن کا ایک دوست کلکتہ آیا تو غالب نے اس سے بڑی فکرمندی کے ساتھ مولانا کا حال دریافت کیا (اردوئے معلّٰی صفحہ 14) جب مولانا کا انتقال ہوا تو غالب نے اس دوست کی موت پر ماتم کیا جو ''فخر ایجاد و تکوین'' (مولانا فضل حق) تھا جبکہ وہ خود مصیبت کی گھڑیاں گن گن کر زندگی کے دن کاٹ رہا تھا (ایضاً صفحہ 42-) امرا کے قدیم طبقے کا جو غم اُسے کھائے جا رہا تھا/ اس کا اس کے مجموعۂ خطوط میں بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر غالب کا خط مورخہ 28 نومبر 1858 لیجیے جس میں وہ یوسف مرزا کو لکھتا ہے: ''میرا حال سوائے میرے اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے، اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متذکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔ یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں (اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے)'' (ایضاً صفحات 55-354) یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اُس وقت خود مصنف کو تنگ دستی کا سامنا تھا۔ ایک بار اُس کے پاس صرف ایک روپیہ سات آنے باقی رہ گئے تھے اور فاقہ کشی کی نوبت آنے میں تھوڑی ہی کسر باقی تھی۔ (ایضاً صفحات 51-250) انگریزوں کے ہاتھوں امرا کی حویلیوں کی تباہی پر رائے زنی کرتے ہوئے غالب نے ایک بار انگریز کو بندر سے مشابہ کیا: ''ایک پہلتن بندر پیدا ہوا ہے۔ مکانات جا بجا ڈھاتا پھرتا ہے۔ فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو گلدستے ہیں انھیں سے ہلا ہلا کر ایک کی بنیاد ڈھا دی۔ واہ رے بندر! یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر۔'' (ایضاً صفحہ 288)

9. کلیات صفحہ 389، نیز رامپور کے نواب یوسف علی خاں کے نام ایک خط مورخہ 14 جنوری 1865 میں۔ (مکاتیب غالب صفحہ 9)

10. کلیات صفحہ 397 نیز ''عود ہندی'' صفحہ 14، غالب نے اپنے روزنامچہ میں عربی زبان کے عام اور معمولی الفاظ اور اصطلاحات کے ترک کا بھی التزام کیا ہے جو اُس زمانے میں مروج اور متداول تھے۔

11. یہ ملاحظہ کرنا باعثِ دلچسپی ہے کہ مصنف نے مولانا فضل حق اور مفتی صدرالدین کے سے بلند پایہ اشخاص کے ناموں کا ذکر نہیں کیا جنھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کی حمایت میں مسلم علما کا فتویٰ صادر کیا اور جو غالب کے یارِ غار اور دوست شمار ہوتے تھے۔ درحقیقت اس کے روزنامچہ میں صرف ایک آدمی کا ذکر ہے اور وہ ہے حکیم احسن اللہ جو انگریزوں کی مدد کرنے کی وجہ سے باغیوں کے کیمپ میں بدنام ہو چکا تھا اور غالب نے اس کیفیت کا خاص طور پر مناسب ذکر کیا ہے (کلیات صفحہ 387)

12. اپنے روزنامچہ میں غالب لکھتا ہے: ''درحقیقت ایک آزاد منش کو واجب نہیں کہ وہ راستی پر پردہ ڈالے۔ خاص طور پر میرے جیسے نیم مسلمان کو جو کسی مذہب و ملت کا پابند نہیں اور جو نیک نامی سے مطلق بے نیاز ہے'' (کلیات صفحہ 407) اس ضمن میں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ گو غالب نے انگریزوں کے خلاف لڑنے میں باغیوں کی بہادری کی داد دی لیکن دہلی میں بے گناہ انگریزوں کا خون بہانے کی وجہ سے انھیں کبھی معاف نہیں کیا۔ ان کی انسان دوستی سے واقف ہونے کے لیے دوسری تصنیفات کے علاوہ اردوئے معلّٰی (صفحہ 42) میں اُن کے ارشادات ملاحظہ فرمائیں۔

13. غالب کے روزنامچے کا اردو زبان میں ایک ملخص نسخہ مولفہ مرزا یعقوب بیگ دہلی سے حسن نظامی نے 1922 میں پہلی بار بعنوان ''غالب کا روزنامچہ'' شائع کیا۔ مجھے 1857 کی بے شمار سرکاری اور غیر سرکاری تواریخ میں کہیں غالب کے روزنامچے کا حوالہ نہیں ملا۔

14. ''فرسنگ'' فاصلے کا ایک پیمانہ ہے۔

15. یہ سکندر اور اس کی آبِ حیات کی تلاش سے متعلق داستان کی طرف اشارہ ہے۔

16. انھی دنوں مصنف نے مارشل لا سے متعلق اپنے مشہور اردو اشعار نظم کیے:

بسکہ فعّالِ مایرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں ہے
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

(اردوئے معلّٰی صفحہ 373)

17. ایک اردو خط میں یہ زیادہ واضح ہے جہاں اس نے اُسے ''قتلِ عام'' کا نام دیا (ایضاً صفحہ 138) ایک اور خط میں اُس نے دہلی پر دوسرے حملہ آوروں کے علاوہ انگریزوں کا بھی ذکر کیا: ''دوسرا لشکر خاکیوں کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان زمین و آثارِ ہستی سراسر لٹ گئے۔'' (عودِ ہندی صفحہ 90)۔

18. ایک اور مقام میں مصنف انگریزوں کا ذکر کرتا ہے جنھوں نے شمع کو گل کر دیا لیکن ساتھ ہی صبحِ صادق کی بشارت دی جو نورِ آفتاب کا پیش خیمہ تھی۔

□□□

ہماری مطبوعات "جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (فنونِ لطیفہ)" سے اقتباس

خطاطی اور خوش نویسی

تخلیقی اظہار (Creative Expression) بنی نوع انسان کا ایک اہم وصف ہے۔ شاعری ہو یا موسیقی، سنگ تراشی ہو یا پینٹنگ، کوئی بھی شکل ہو، بہر حال وہ مناظر کو لافانی بنا دیتی ہے۔ پتھروں، مہروں، لکڑی یا دیواروں پر کی گئی دستی تحریر کے ذریعے حسین منبت کاری یا نقش نگاری اس بات کی شاہد ہے۔ خوش نویسی بھی ایک ایسا ہی فن ہے جو دستی تحریر کے ذریعے الفاظ و حروف کو زندہ جاوید بنا دیتا ہے۔ انگریزی اصطلاح کیلی گرافی (Calligraphy) یونانی الفاظ Kallos اور Graphos کا مجموعہ ہے۔ Kallos کا مطلب ہے 'حسین' اور Graphos کے معنی لکھنے یا لکیر کھینچنے کے ہوتے ہیں۔ خوش نویس حضرات مقدس صحیفوں اور حکیمانہ اقوال کے اقتباسات، شاعرانہ مصرعوں اور قطعات وغیرہ کو حسین انداز میں منبت کاری یا نقاشی کا کام انجام دیتے ہیں۔ خوش نویسی کے لیے نرسل / نرکل کا قلم (Pen of Reed) استعمال کیا جاتا ہے۔

دستی تحریر کے قدیم نمونے غاروں کی دیواروں اور قدیم مہروں (Seals) سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ مہروں میں وادیِ سندھ کی تہذیب سے دستیاب ہونے والے نمونے بھی شامل ہیں۔ یوروپ میں رومن سلطنت کے دوران عام استعمال کے لیے فنِ تحریر کو ترقی دی گئی۔ پانچویں صدی میں رومن سلطنت کے زوال کے بعد روز مرہ کے کام کاج میں تحریر سے کام لینے کا رواج بھی ختم ہو گیا۔ لیکن تعلیم یافتہ لوگ اور آرٹسٹ برابر اس کام میں لگے رہے اور ان لوگوں کی کاوش سے تحریر اور خوش نویسی مسلسل ترقی کرتی رہی۔ مگر طباعت (Printing) اور ٹائپ رائٹر کی ایجاد نے اس کام کو بری طرح متاثر کیا اور الفاظ کو حسین انداز میں ظاہر کرنے کا کام کاتبوں، پیشہ وروں اور آرٹسٹوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔

چینیوں، جاپانیوں، مصریوں اور عربوں نے خوش نویسی کو ایک آرٹ کی شکل میں ترقی دی۔ خطاطی کا منفرد فن جزیرہ نما عرب اور ایران میں پروان چڑھا۔ یہی خطاطی ہندستانی خوش نویسی کا اہم وسیلہ بن گئی۔ یہاں کے باسیوں نے قرآن مجید کی آیات کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے سراسر اسی انداز میں تحریر اور خطاطی رموز و اسرار یا پیچیدگیوں کا سہارا لیا اور اسی لیے اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فن اسلامی کلچر سے زیادہ وابستہ ہے۔

خوش نویسی کی ایک کمتر شکل کتابت ہے۔ کتابت میں بہت حد تک پروازِ فکر اور تخلیق سے کام نہیں لیا جاتا۔ کمپیوٹر تکنیک اور لینگویج سوفٹ ویئرس (Language Softwares) کے وجود میں آنے سے قبل کتاب چھپوانے سے پہلے کسی کاتب سے مسودے کی خوبصورت کتابت کروائی ہوتی تھی، اس وجہ سے خوش نویسی دو طرح سے — ایک تو صناعی یا آرٹ کی اعلاترین شکل میں اور دوسرے طباعت میں اس کے پیشہ ورانہ استعمال سے — پروان چڑھتی چلی گئی۔

ہندستان میں خوش نویسی کی قدیم شکل وادیِ سندھ کی تہذیب سے حاصل شدہ نمونوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ حالانکہ اس تہذیب سے وابستہ مہروں پر ثبت تحریر کے اسرار و رموز بھی ہماری سمجھ میں نہیں آئے ہیں تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ مہریں قدیم آرٹ کا نادر نمونہ اور اس بات کا ثبوت ہیں کہ دستی تحریر کو فروغ دینے کا کام اسی دور میں شروع ہو چکا تھا۔ ہندستان میں، خوش نویسی کا فن عہد وسطیٰ میں پروان چڑھا اور پھر یہ اس عہد کے فنِ تعمیر کی نمایاں شکل اختیار کر گیا۔ زیادہ تر مساجد، مقابر اور محلات کے دروازوں، ستونوں اور چھتوں کو ایسے پتھروں سے مزین کیا گیا جن پر نہایت حسین طرزِ تحریر میں قرآنی آیات اور اشعار کندہ ہیں۔ اس ضمن میں آگرہ کے تاج محل اور دہلی کی قطب مینار کو مثال

● کونسل نے اردو میں پہلا مکمل اور بین الاقوامی معیار کا انسائیکلوپیڈیا شائع کیا ہے۔ اس کا سارا مواد بڑی دیدہ ریزی اور مشقت کے ساتھ سلیس زبان اور دلنشیں پیرایے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایسی کاوش ہے جو آئندہ کئی نسلوں کو علم و دانش سے مالامال کرتی رہے گی۔ ادیبوں، صحافیوں، طلبہ اور علم دوست قارئین کے لیے ایک نادر تحفہ، ہر جلد اپنے آپ میں مکمل ہے۔ یہ انسائیکلوپیڈیا مکمل آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ فنون لطیفہ پر مبنی آٹھویں جلد کی قیمت 250 روپیے ہے۔ جامع اردو انسائیکلوپیڈیا کی 6 جلدیں منظرِ عام پر آچکی ہیں جن کی مجموعی قیمت -/1555 روپیے ہے۔ کونسل اپنی مطبوعات پر اساتذہ اور طلبہ کو 40 فیصد رعایت دیتی ہے۔

کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ انھیں اس فن کا بہترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ شجاعت، شاعری اور موسیقی کے علاوہ شہزادوں اور روٗسا سے تعلق رکھنے والے افراد کو خوش نویسی کا فن بھی سکھایا جاتا تھا۔ آئینِ اکبری میں مشہور و معروف خطاطوں کے ناموں کی ایک پوری فہرست موجود ہے۔ انھی خطاطوں میں عبدالرشید دہلوی اور محمد حسین کشمیری کے اسمائے گرامی بھی موجود ہیں جو شہنشاہ اکبر کے اساتذہ تھے۔ تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ قلی قطبؒ شاہ، سلطان نصیر الدین محمود گوان، رقیہ سلطانہ اور اورنگ زیب وغیرہ خطاطی میں ماہر تھے اور ان کے تحریر کردہ قرآن مجید کے نسخے آج بھی عجائب گھروں میں موجود ہیں۔

تاہم مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ اس فن میں بھی زوال ہوتا چلا گیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بازاری طلب (Market Demand)اور معیار میں بھی نشیب و فراز آتے چلے گئے۔ خوش نویسی کے روایتی مراکز ختم ہوتے گئے لیکن اس فن لطیفہ کو ختم ہونے سے بچانے اور محفوظ رکھنے کے لیے مختلف اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ جن اداروں میں صرف خطاطی/خوش نویسی سکھائی جاتی تھی اب وہاں اس فن کو گرافک ڈیزائن اور کمپیوٹر سے جوڑ کر اس میں جلا بخشی گئی ہے۔ اس ضمن میں قومی اردو کونسل کا نام اہم ہے جس نے ملک کے طول و عرض میں چل رہے 'خطاطی/ خوش نویسی' مراکز کے خطاطی کورس کو گرافک ڈیزائن اور کمپیوٹر سے جوڑ دیا ہے۔ اس سے نہ صرف خطاطوں/کاتبوں کو روزی روٹی کے مسئلے سے چھٹکارا ملے گا بلکہ فائن آرٹ کالجوں میں داخلے کے امکانات بھی روشن ہو گئے ہیں۔ اس طرح اس فن کی بقا اور تحفظ کے لیے قومی اردو کونسل، نے مستحسن کام انجام دیا ہے۔

فن خوش نویسی کی مختصر تاریخ اور اساتذۂ فن کا تعارف (عہد اسلام):

انسان کی ترقی کا دارومدار علم پر ہے اور علم بغیر لکھائی اور پڑھائی کے کچھ بھی نہیں۔ اسلام تمام نوع انسانی کی ترقی اور بہبود کا داعی ہے اور اسلام کی بنیاد بھی پڑھائی اور لکھائی پر ہے۔ ارتقائے حیات میں شروع ہی سے تحصیل علم (جس میں پڑھنا اور لکھنا دونوں شامل ہیں) کو ایک مقدس فریضہ سمجھا گیا، مسلمانوں پر قلم کا تقدس اور انسانی تہذیب کی ترقی میں اس کی اہمیت کھل کر واضح کی گئی۔ مسلمانوں نے شروع ہی سے علم الکتابت یا خطاطی کو ایک مقدس فن کا درجہ دیا ہے۔

یہ واقعہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اکرمؐ نے غزوۂ بدر (ماہ رمضان المبارک 2ھ/فروری 624) کے 70 پڑھے لکھے قیدیوں پر رہائی کی یہ شرط عائد کی کہ ہر قیدی دس دس مسلمان بچوں کو پڑھنا اور لکھنا سکھائے، اس طرح نہایت قلیل مدت میں سات سو سے زائد مسلمان فن کتابت سے واقف ہو گئے۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے بھی اسی طرح لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔

تاریخ شاہد ہے کہ زمانۂ قدیم ہی سے انسان کا ذہن علوم و فنون کی طرف مائل رہا ہے اور اسی ذوق و شوق اور دلچسپی کے باعث ہر زمانے میں ترویج و اشاعت کی نئی نئی شکلیں وجود میں آتی رہی ہیں اور انھی شکلوں پر انسانی معاشرے کا ڈھانچہ بھی تیار ہوتا رہا ہے۔ ابتدا سے ہی مختلف فنونِ لطیفہ سے عربوں کو ایک خاص لگاؤ رہا ہے بالخصوص خوش نویسی و خطاطی، ظروف سازی اور آئینہ گری وغیرہ میں انھوں نے مہارت تامہ حاصل کی تھی۔

فن خطاطی جو تزئین کاری اور نقش و نگار سے متعلق ہے اس کا انحصار در اصل جیومیٹریکل آرٹ پر ہے مثلاً لکیریں، زاویئے، مثلث، مربع اور دائرے وغیرہ۔ ماضی کے تقریباً ایک ہزار برسوں میں عربوں نے فن خطاطی میں نہ صرف مہارت حاصل کی ہے بلکہ متقدمین کی روش کے محدود دائرے سے نکل کر اس فن میں وسعت و ندرت بھی پیدا کی اور خالق کائنات کی عطا کی ہوئی مخصوص صلاحیت کے سبب اس اختراع و ایجاد میں اپنی ذہنی نظافت و جدت کا بے پناہ مظاہرہ کیا ہے۔

چونکہ بیشتر خطاط مسلمان تھے اور اسلام میں تصویر کشی کی ممانعت ہے اس لیے فنکاروں نے خطوط کے ذریعے اپنی طبع آزمائی کی اور طرح طرح کے خطوط ایجاد کیے نیز تصوری خطوط کے نام سے انسانوں، جانوروں، جہازوں اور محرابوں و میناروں کی شبیہ بنا کر اپنی صناعی کا مظاہرہ کیا ہے۔

فن خطاطی صرف مسلمانوں کی روحانی تسکین کا باعث نہیں بنا بلکہ ان کے جمالیاتی ذوق کا ایک ذریعہ بھی ثابت ہوا۔ شکل و صورت دینے کے لیے فن خطاطی میں ایسے بے شمار تجربات کیے کہ آج یہ فن مسلمانوں کے جمالیاتی ذوق کی ترجمانی کر رہا ہے۔

مشرق وسطیٰ سے باہر جہاں کہیں بھی مسلمان گئے ساتھ میں فن خطاطی بھی لے کر گئے اور اسے وہاں کے حالات اور ضروریات کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کیا کہ نہ تو اس فن کے اسلامی تشخص کو کوئی زد پہنچی اور نہ مقامی ضروریات کو ہی قربان کرنا پڑا بلکہ دنیا بھر کے رسم الخط میں صرف اسلامی فن خطاطی ہی ایسا فن ہے جسے

جلیل القدر شہنشاہوں نے اپنی روحانی تسکین اور جمالیاتی ذوق کی خود آگاہی کے لیے سیکھا اور ان ہی بادشاہوں و شہنشاہوں نے ماہرین فن کی اپنے امرا و وزرا سے زیادہ قدر کی۔ دنیا کے کسی اور رسم الخط کو یہ مقام کبھی بھی حاصل نہیں ہوا۔

فن خطاطی کو اس مقام تک پہنچانے میں مسلمانوں کا خونِ جگر ہی نہیں بلکہ فن کتابت کا تقدس اور اس فن کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت کے عناصر بھی شامل ہیں۔

فن خطاطی میں خطوط کی بے انتہا قسمیں ہیں جو واضح طور پر شاہانہ ذوق اور عام ذوق کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس کے بیش بہا نمونے عرب کے علاوہ ہندستان، پاکستان، ایران، عراق، اسپین، چین، ترکی اور مصر میں بھی موجود ہیں۔

معتبر تاریخی کتابوں میں جو بات قابلِ یقین اور معتبر ہے وہ یہی ہے کہ اسلامی دور میں سب سے پہلے جو شخص قرآن کریم کی کتابت اور خوش خطی کے فن میں ماہر تھا وہ خالد بن ابوالہیاج تھا جس کا کوئی خط دنیا میں مشہور ہے اور سعد نے اس کو منصب کتابت پر مقرر کیا تھا اور یہ دوسرے رسوم الخط کا موجد بھی تھا اور یہی وہ خوش نصیب شخص ہے جس کو مسجد نبویؐ میں سورۂ الشمس لکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے قرآن کریم لکھنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ اس نے بڑی مہارت اور ہنر مندی سے سنہری حروف میں قرآن کریم کی کتابت مکمل کر کے عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس لے گیا جب انھوں نے اس قرآن کریم کو دیکھا تو اس کو بوسہ دیا، اور اپنے سر اور آنکھوں سے لگایا۔

ابو یحییٰ، مالک بن دینار (م۔ 130ھ) جو اُجرت پر قرآن کریم کی کتابت کرتے تھے اور اسی طرح قرآن کریم کی کتابت کرنے والے خوش نویس خوشنام البصری اور مہد الکوفی تھے جو بزمانہ خلیفہ ہارون رشید ہوئے اور ایسے ہی ایک اور خوش نویس ابو حدمی الکوفی بھی تھے جو خلیفہ معتصم عباسی کے دور میں ماہرین فن میں شمار کیے جاتے تھے۔

ان ماہرین فن کے بعد خوش نویسوں کی ایک اور جماعت منظر عام پر آئی جن میں ابن ام شیبان، مسحور، ابوحمیرہ، ابن حمیرہ اور ابوالفرج (جو ابن ندیم کے زمانے میں موجود تھے) اور وہ لوگ جو کہ قرآن کریم کی کتابت رسم الخط محقق میں یا اور کسی خط میں کرتے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں: ابن ابی حسان، ابن الحضرمی، ابن زید، محمد بن یوسف، ابن ابی فاطمہ، ابن سیر، ابن حسن الملیح، ابوعقیل، ابومحمد اصفہانی، ابوبکر احمد بن نصر اور ان کا بیٹا ابوالحسن وغیرہ۔

خلافت بنواُمیہ کے زمانے میں جو شخص قرآن کریم کی کتابت میں مشہور اور اپنی خوش خطی کے لیے معروف تھا وہ قطبہ تھا، جس نے اپنی ہنر مندی اور طبعی ذہانت سے چار قسم کے رسم الخط ایجاد کیے۔ اس کے بعد خلافت بنوعباس کے ابتدائی دور میں اس فن میں ضحاک بن عجلان متوفی 154ھ یکتائے زمانہ ہوا۔ اس نے دل پسند کشش کا اضافہ کر کے فن خوش خطی کو مزید زیب و زینت بخشی۔ اس کے بعد اسحاق بن حماد، عباسی خلفا، منصور و مہدی کے زمانے میں اسی فن خوش نویسی میں مشہور ہوا اور بہت سے طلبہ نے فن خوش نویسی کی تعلیم اور تکمیل اسی خطاط کے زیر تربیت کی ان میں سے چند شاگردوں کے نام یہ ہیں: یوسف کاتب (جس کو لقوہ شاعر کے لقب سے یاد کرتے تھے) اور ابراہیم بن الحسن (جس نے یوسف پر برتری حاصل کی) اور عثان بن زیاد العائل اور محمد بند عبداللہ مدنی، ابوالفضل صالح اور عبدالملک تیمیمی خراسانی وغیرہ۔

یہ سب خطاط بارہ رسوم الخط کے ماہر تھے اور وہ رسوم الخط یہ ہیں: قلم الجلیل، قلم السجلات، قلم الدیباج، قلم السطومار الکبیر، قلم المواصرات، قلم الثلثین، قلم الزنبور، قلم المفتح، قلم الحرم، قلم العہود، قلم القصص اور قلم الخرجات۔ تیسری صدی ہجری تک یہ سب عربی خطوط رائج تھے لیکن جب ابن مقلہ نے ثلث، ریحان، محقق، نسخ، توقیع اور رقاع چھ قلم ایجاد کیے تو یہ خطوط معدوم ہو گئے۔ ان کے علاوہ خط مدبج، خط مرصع، خرزباش، خط رخش، خط بیاض اور خط حواشی بھی جاری تھے جو خوش نویسی اور قرآن کریم سے مخصوص تھے۔ مامون کے عہد میں ان جملہ خطوط کے لکھنے والے موجود تھے، جن کا تعلق شاہی دفاتر سے تھا۔

ابن مقلہ (272-328 / 884-940) فخر روزگار کاتب کا نام ابو علی محمد بن علی بن حسن بن عبداللہ ملقب بہ ابن مقلہ تھا۔ عالم شباب ہی میں تکمیل علوم وفنون کے بعد اس کا اقبال بلند ہوا۔ یہ تین عباسی خلفا المقتدر باللہ، القاہر باللہ اور الراضی باللہ (295-322 / 908-934) کا وزیر بنا، اور جب زوال آیا قید ہوا اور ہاتھ کے ساتھ زبان قطع ہوئی اور قید ہی میں فوت ہوا۔

ابوالاسود کے زمانے سے احوال المحرر تک اگر چہ خط کوفی میں غیر معمولی ترقی ہوئی مگر اس میں نمایاں شان اور دلفریب حسن پیدا نہیں ہوا تھا۔ آخر کار یہ حصہ ابن مقلہ کے ہاتھ آیا۔ چنانچہ اس نے خط کوفی سے

310 / 922 میں نسخ ایجاد کیا۔ اس کے علاوہ مزید اس نے پانچ خط، خط محقق، خط ریحان، خط ثلث، خط توقیع اور خط رقاع وضع کیے۔ ایک گروہ خط غبارہ کا بھی ان خطوط میں اضافہ کر کے اب مقلہ کو سات خطوط کا موجد قرار دیتا ہے۔

ابن مقلہ نے احوال المحرر اور دوسرے خطاطوں کی وصلیوں سے استفادہ کیا تھا اور اب تک اُن میں جو خامیاں رہ گئی تھیں اُن کی اصلاح کر کے خط نسخ ایجاد کیا تھا۔

موجودہ خوبصورت اعراب ثلاثہ جزم، تشدید اور تنوین ابن مقلہ کی اختراع ہے۔ ابن مقلہ کے شاگردوں میں محمد بن دیسمانی اور محمد بن اسد نامور خطاط ہوئے۔ ابن مقلہ کا بھائی ابوعبداللہ حسن ابن علی بھی کاتب تھا۔ ان دونوں بھائیوں کے والد علی بن حسن بھی خوش نویس اور ان کے دادا مقلہ بھی کاتب تھے۔ گویا پورا خاندان کتابت سے تعلق رکھتا تھا۔

ابن مقلہ کا خطاطی پر یہ ایک احسان عظیم ہے جس کی وجہ سے اس کو شہرت اور عظمت ملی۔ اس نے عربی خط کے اصول وقواعد مقرر کیے اور قلم کے قط کو اس کی اکائی قرار دیا اور اس کی اس جدت سے خط میں ایک طرح کا تناسب پیدا ہوا۔

ابن البواب (350-413/961-1022) ابن مقلہ کے بعد ابوالحسن علی بن بلال نادر روزگار خوش نویس پیدا ہوا۔ اس کے والد بلال امیر بویہ (320-447/932-1055) کے دروازے پر چوکیدار (بواب) تھے۔ چنانچہ اس نسبت سے ابن البواب مشہور ہوا۔ یہ آل بویہ کے امیر بہاء الدولہ بن بویہ (379-403/989-1012) کے یہاں مہتمم کتاب خانہ تھا۔

ابن مقلہ نے اگرچہ مذکورہ خطوط ایجاد کیے تھے لیکن ان کی تہذیب اور حسن و جمال کا سہرا جملہ خطاط ابن بواب کے سر ہے۔ آج دنیا میں جہاں بھی خط نسخ جاری ہے اس کے لیے دنیا ابن مقلہ اور ابن بواب کی مرہون منت ہے۔

کہتے ہیں کہ ابن بواب نے امیر بہاء الدولہ کی فرمائش پر ابن مقلہ کے رقم کردہ 29 سی پاروں کے بعد تیسواں پارہ اس طرح رقم کیا کہ امیر بہاء الدولہ استاد و شاگرد دونوں کی تحریر میں تمیز نہ کر سکا۔ اس نے اپنی زندگی میں چونسٹھ قرآنِ کریم کے نسخے لکھے اور عام طور پر ہر تین ماہ میں قرآن کریم کا ایک نسخہ لکھ لیا کرتا تھا۔ ابن بواب کی خطاطی کے بعض نمونے توپ کپی میوزیم، استنبول میں بھی پائے جاتے ہیں۔

ابن بواب نے کثیر تعداد میں اپنے تلامذہ کی تربیت کی جو اس کی طرز کتابت کے پیرو تھے۔ عہد عباسی کا آخری اور عالم اسلام کا سب سے مشہور خطاط یاقوت بن عبداللہ الرومی المستعصمی ہوا ہے۔ یاقوت لقب کے کئی کاتب ہوئے ہیں جو اپنے حسن خط کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ اگرچہ عام طور پر لوگ ان سب کو یاقوت المستعصمی ہی تصور کرتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ ان میں سے دو یاقوت قرآن کریم کی خطاطی میں زیادہ مشہور ہوئے، جن میں سے ایک 'یاقوت الموصلیؒ' اور دوسرا 'یاقوت المستعصمی' تھا۔

یاقوت المستعصمی (698/1298) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ خلیفہ مستعصم باللہ (640-656/1242-1258) جو آخیر عباسی خلیفہ تھا، نے یاقوت کو غلامی سے آزاد کر کے اس کی تربیت کی اسی نسبت سے اسے المستعصمی کہا جاتا ہے۔ اس نے ابتدا میں عبد المومن بن صفی الدین اموی اور شیخ ابن حسین سے مشق کی۔ اس کے معاصرین میں نصیر الدین طوسی اور شمس الدین صاحب دیوان تھے۔ المستعصمی عہد عباسیہ میں بغداد کا سب سے بڑا کاتب تھا اور خط نسخ کا آخری امام بھی۔ اس نے قرآن کریم کی خطاطی میں حیرت انگیز جدتیں پیدا کیں اور ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ وہ قرآن پاک کی کتابت 11 سطر فی صفحہ کے حساب سے کرتا تھا۔ ان سطروں میں پہلی، چھٹی اور گیارہویں سطر کو ذرا جلی قلم سے ثلث میں لکھتا تھا اور دیگر سطور (2-5 اور 7-10) خط نسخ میں لکھتا تھا۔ آج بھی ان کا طرز ضرب المثل ہے۔ المستعصمی کی وفات کے بعد ان کا فیض ان کے چھ باکمال شاگردوں کے ذریعے جو 'استادان شش گانہ' کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں، پورے عالم اسلام میں جاری و ساری ہوا۔

ابن مقلہ نے خط کوفی اور معقلی کی تراش خراش سے جو خطوط ایجاد کیے اسی طرح ایک عرصے کے بعد ایران کے حسن فارسی نے ان کے ایجاد کردہ چھ خطوط میں سے خط توقیع اور رقاع کی آمیزش سے ساتواں خط تعلیق ایجاد کیا۔

اس دنیا میں آپ جو کچھ حسن و جمال دیکھ رہے ہیں، اس میں انسانی تجربات کو بڑا دخل ہے۔ فن خطاطی کے ماہرین نے بھی ان ساتوں خطوط پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جدید سے جدید تر کی تلاش میں لگے رہے۔

لہٰذا امیر تیمور اور گورگان بادشاہ صاحب قران کے دور حکومت میں

خواجہ میر علی تبریزیؒ نے ماوراالنہر میں خط نسخ اور تعلیق کے امتزاج سے ایک نیا خط، خط نستعلیق ایجاد کیا۔ نسخ اور تعلیق کی نسبت سے نستعلیق کی پیوند کاری میں سب کی رعنائی و زیبائی، لطافت اور نزاہت پیدا ہوگئی اور الفاظ کے صوری حسن میں بے پناہ اضافہ ہوا اور اس کا نام نسختعلیق رکھا گیا، مگر خ حذف ہوگئی اور اور نستعلیق مشہور ہوا، اور آج اردو زبان کی کتابت و اشاعت میں جو خط رائج ہے یہ وہی خط ہے جسے ایرانی نژاد خواجہ میر علی تبریزی نے ایجاد کیا تھا۔

خط نستعلیق کی ترویج اور اس کا عروج ایران میں عباسی قلی شاہ کے عہد میں ہوا۔ اس وقت ہندستان میں شاہ جہاں تخت سلطنت پر جلوہ فرما تھے۔ سلطنت ایران میں اس زمانے میں وہ شخص بھی موجود تھا جسے خط نستعلیق کا امام کہا جاتا ہے یعنی میر عماد۔ میر عماد کے خط کی روش میر علی تبریزی کے خط کی شان و صفا کی اتباع کرتے کرتے اس سے بڑھ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وصلیاں اب نایاب ہیں۔ میر عماد کے تلامذہ کی ایک طویل فہرست ہے مگر ان میں چند ایسے بھی ہیں جنھوں نے استادان فنکار کا مقام حاصل کیا۔ خصوصاً آغا عبد الرشید دیلمی وہ واحد شخص ہے جس کے آفتاب فن سے ہندستان میں بلند پایہ خطاطی کا چراغ روشن ہوا۔ آغا دیلمی میر عماد کے بھانجے، داماد اور شاگرد تھے، وہ میر عماد کی طرز پر لکھتے تھے۔ ان کا ترتیب و تصنیف کیا ہوا ایک قلمی نسخہ 'رسالۂ خوش نویسی' کے نام سے مولانا ابوالکلام آزاد عربک، پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک، راجستھان میں موجود ہے۔

آغا عبد الرشید کے شاگردوں میں حافظ نور اللہ اور قاضی نعمت اللہ کو بڑا کمال حاصل ہوا۔ حافظ کے فن کی قدردانی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کی لکھی ہوئی وصلیاں موتیوں کے عوض خرید لی جاتی تھیں۔ حافظ نور اللہ کے قلم کا ایک نادر نمونہ بھی اے۔ پی۔ آر۔ آئی ٹونک میں محفوظ ہے۔

حافظ کے بیٹے حافظ ابراہیم اپنے استادِ فن باپ کی طرح ماہر خطاط تھے۔ ان کے شاگرد منشی سروپ سکھ دیوانہ میاں وجیہ اللہ اور محمد عباس مشہور ہیں۔ حافظ ابراہیم کے شاگردوں میں ان کے صاحبزادے حافظ سعید الدین اور منشی عبد المجید خریطہ نگار تھے۔ حافظ کے گذشتہ دور میں دو شاگرد بہت مشہور ہوئے۔ ایک منشی ہادی علی دہلوی دوسرے پنڈت منسا رام کاشمیری۔ ہادی علی نستعلیق کے ساتھ ساتھ طغریٰ سازی کے بھی ماہر تھے۔ منشی شمس الدین اعجاز رقم خط نستعلیق کے ایک باکمال استاد گزرے ہیں۔ انھوں نے فنِ خوش نویسی پر کئی رسالے لکھیں ہیں جن میں کاپی نمبر 1 تا 5 'اعجاز رقم' اور 'تنویر الشمس' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ منشی اعجاز رقم سے قبل سید محمد امیر رضوی بھی بہت نامور اور باکمال خطاط گزرے ہیں، جن کا سلسلۂ تلمذ مولانا علام محمد ہفت قلمی سے بتایا جاتا ہے۔ اپنے دور کے معروف خطاطوں میں مولانا غلام محمد ہفت قلمی کا بھی نام سرفہرست آتا ہے اور مولانا ہندستان کے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے خوش نویسوں کا تذکرہ فارسی میں 'تذکرۂ خوش نویساں' کے نام سے ترتیب دے کر زیور طبع سے آراستہ کیا۔ اس تذکرہ کا اُردو ترجمہ مولانا محمد عبد الحیٔ فائز ٹونکی نے کیا ہے، وہ بھی مولانا ابو الکلام آزاد عربک، پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک سے شائع ہو چکا ہے۔ مذکورہ ادارے میں غلام محمد ہفت قلمی کی نسخ اور ثلث آمیز تحریر کردہ وصلی بھی موجود ہے۔

مولانا غلام محمد ہی نے سید محمد امیر رضوی 'میر پنجہ کش' کو فن خطاطی کی اعلا تربیت کے سلسلے میں آغا عبد الرشید دیلمی کی روش کو اپنانے اور ان کی طرز مشق کرنے کی صلاح دی تھی۔ مولانا کی اس روایت کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میر پنجہ کش نے آغا عبد الرشید کی طرز پر خوش نویسی کی مشق و ممارست شروع کی اور اس حد تک محنت کی کہ عام لوگوں کے لیے دونوں کے خط میں امتیاز کرنا مشکل ہوگیا۔

محمد امیر رضوی کو جیسا کمال فن خوش نویسی میں حاصل تھا ویسا ہی پنجہ کشی میں بھی حاصل تھا۔ علاوہ ازیں مصوری، نقاشی، جدول کشی، لوح نویسی اور سنگ تراشی میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی۔ محمد امیر رضوی 'پنجہ کش' اس فن کے آخری تاجدار کہلاتے ہیں۔ ان کی وفات 1857 میں غدر دہلی کے دوران بعمر 90 سال ایک سپاہی کے ہاتھوں گولی مارنے کے سبب ہوئی۔

خط نستعلیق میں اکتساب و اجتہاد کرنے والی ایک قابل ذکر شخصیت منشی محمد یوسف دہلوی کی ہے جنھیں خطاطی کا فن ورثے میں ملا۔ انؒ کے والد بزرگوار منشی محمد دین کو غلاف کعبہ پر خطاطی کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ دہلی کی بہت سی عمارات میں یوسف کی خطاطی کے نمونے کندہ ہیں۔ انھوں نے خط نستعلیق میں جدید روش اختیار کر کے حروف کے قدیم پیمانوں میں خوبصورتی پیدا کی۔ ان کی اس طرز جدید کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ وہاں بھی انھوں

نے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے اور کافی مقبولیت حاصل کی۔ 1977 میں ایک کار حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ ان کے تلامذہ میں عبد المجید دہلوی سرفہرست ہیں جن کی خطاطی کے شہ پارے پاکستان کے قائد اعظم محمد علی جناح کے مزار مبارک پر زندۂ جاوید ہیں۔

یوسف کی ایک بہن (جن کا نام فاطمۃ الکبریٰ ہے) نے نستعلیق کے علاوہ خط نسخ میں بھی کافی مہارت حاصل کی اور وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے قرآن پاک کی مکمل کتابت خط نسخ میں فرمائی۔

دور جدید میں خط نسخ کے ممتاز کاتب مولانا محمد یوسف قاسمی ہیں جو کہ مولانا اشتیاق احمدؒ دیوبندی کے شاگرد ہیں اور عرصے سے دہلی میں قیام پذیر ہیں۔ مولانا خط نسخ کے فروغ و ارتقا کے سلسلے میں پوری جدوجہد میں مصروف ہیں۔ انھوں نے قرآن کریم کے کئی نسخوں کی کتابت مکمل کی ہے۔ انھوں نے ایک قرآن کریم کی کتابت اس طرز پر کی ہے کہ اس کے ہر صفحے کی ہر سطر الف سے شروع ہوتی ہے۔ یہ ان کی بہت ہی معیاری اور دیدہ زیب کتابت کا اعلا نمونہ ہے جو مختلف سائزوں میں زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک سی ورقی قرآن پاک کی کتابت فرمائی وہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ فی الوقت وہ ایک اور الفی قرآن پاک کی کتابت بھی مکمل کر چکے ہیں (اللّٰہم زد فزد)۔

محمد خلیق ٹونکی خطاط اعظم ہند تھے۔ تقسیم ہند کے بعد جن حضرات نے ہندستان میں فن خطاطی کی بقا اور اس کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کیا، ان میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ آج کی نسل ان نامساعد اور حوصلہ شکن حالات کا اندازہ بھی نہیں کر سکتی جن کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے خلیق ٹونکی نے تقریباً پچاس برس تک اپنے خون جگر سے شجر خطاطی کی آبیاری کی۔ انھوں نے نہ صرف خود فن خطاطی میں بلند معیار پیش کیا بلکہ بے شمار طالبانِ فن کو تربیت بھی دی جو نہ صرف ہندستان بلکہ کئی عرب ممالک میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

محمد خلیق خاں المعروف خلیق ٹونکی 1932 میں ٹونک (راجستھان) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے خوش نویسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم حافظ محمد صدیق خاں اور دادا، محمد خاں (منیجر مطبع محمدی ٹونک) سے حاصل کی اور تیرہ برس کی عمر میں مطبع محمدی میں خوش نویس کی حیثیت سے ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

تقسیم برصغیر کے بعد ٹونک کا چھاپہ خانہ بند ہو گیا چنانچہ 1948 میں وہ ممبئی چلے گئے۔ جہاں انھوں نے محمدی پریس، سلطانی پریس اور کریمی پریس میں بحیثیت خوش نویس کام کیا۔ 1949 میں وہ احمد آباد چلے گئے اور وہاں مختلف طباعتی اداروں میں نقش نگار، گل کاری اور ڈیزائننگ وغیرہ کے کام انجام دیے۔

1950 میں خلیق ٹونکی کو جمعیۃ علمائے ہند نے خوش نویسی کی خدمات کے لیے دہلی بلوایا۔ اس دوران انھوں نے کئی معروف دینی، علمی و ادبی اداروں کے مطبوعات کے ٹائٹل تیار کیے، اس کے علاوہ کئی اہم کتب کی، انتہائی محنت، سلیقے اور معیار کا لحاظ رکھتے ہوئے خوبصورت کتابت بھی کی ان میں قصص القرآن، تفسیر کشف مصباح اللغات اور دیوانِ غالب نیز 'صفیر خیال' قابل ذکر ہیں۔

سابق وزیر تعلیم ہند 'پروفیسر نورالحسن مرحوم' خلیق ٹونکی کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے۔ 1976 میں ان کے کہنے پر، خلیق ٹونکی غالب اکیڈمی، دہلی میں طالب علموں کی تربیت کے خاطر اعلا خطاطی کلاس کے سربراہ بن گئے۔ اس منصب پر وہ تادم آخر فائز رہے۔ اس دوران انھوں نے کثیر تعداد میں طالب علموں کو مختلف خطوط مثلاً نستعلیق، نسخ، ثلث، دیوانی، رقعہ، طغریٰ کی تعلیم دی۔ ان کے شاگردوں میں سے اکثر، ہندستان کے مختلف شہروں میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے قائم کردہ مراکزِ خوش نویسی میں بحیثیت استاد خدمات انجام دے رہے ہیں۔ خلیق ٹونکی کو فن خطاطی میں نمایاں خدمات کے صلے میں کئی اعزازات و القابات سے نوازا گیا۔

خلیق ٹونکی کے یادگار کارناموں میں چودھویں صدی ہجری کے آغاز پر حکومت ہند کا جاری کردہ خوبصورت طغرے والا ڈاک ٹکٹ بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ ان کے فن کا سب سے بڑا اور ہمیشہ یاد رکھا جانے والا شاہکار 'ممبئی حج ہاؤس' پر خط ثلث میں کی گئی خوبصورت خطاطی ہے اور یہ عمارت موصوف کی دلکش خطاطی کی وجہ سے ہر راہ گیر کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتی ہے۔

آخری ایام میں ان کو مرض سرطان لاحق ہو گیا تھا۔ ان کا انتقال 1994 میں ہوا۔

□□□

امیت جین، سمرات شرما، سوربھ بنرجی

"مائکروسافٹ پاور پوائنٹ" سے اقتباس

پاور پوائنٹ کا تعارف

- New: ایک نیا ڈاکومنٹ کھولتا ہے۔
- Save: چل رہے ڈاکومنٹ کو سیو کرتا ہے۔
- Spelling: اسپیلنگ چیک کرتا ہے۔
- Copy: سلیکٹ کیے گئے آبجیکٹ کی کاپی کرتا ہے۔
- Format Painter: فارمیٹنگ کو کاپی کرنے میں مدد کرتا ہے۔
- Redo: آخری بار انڈو کیے گئے کام کو ری ڈو کرتا ہے۔
- Draw Table: ٹیبل ڈرا کرنے میں مدد کرتا ہے۔
- Insert Chart: ایم ایس گراف چارٹ انسرٹ کرتا ہے۔
- Drawing: ڈرائنگ ٹول بار کو ڈسپلے یا ہائڈ کرتا ہے۔
- Insert new Slide: پریزنٹیشن میں ایک نیا سلائڈ انسرٹ کرتا ہے۔
- Help: آفس اسسٹنٹ یا Help کو ظاہر کرتا ہے۔
- Open: سیو کیے گئے ڈاکومنٹ کھولتا ہے۔
- Print: پرنٹ ڈائیلاگ باکس کھولتا ہے۔
- Cut: سلیکٹ کیے گئے آبجیکٹ کو کلپ بورڈ میں رکھتا ہے۔
- Paste: میموری سے سلیکٹ کیے گئے مضمون کو پیسٹ کرتا ہے۔
- Undo: آخری عمل کو انڈو کرتا ہے۔
- Insert Hyperlink: یہ www سے لنک قائم کرتا ہے۔
- Insert Table: انسرٹ پوائنٹ پر ورڈ ٹیبل ڈرا کرتا ہے۔
- Expand all: تمام سلائڈس کو پھیلاتا ہے۔
- Show Formatting: فارمیٹنگ کو ڈسپلے یا ہائڈ کرتا ہے۔
- Grayscale Preview: گرے اسکیل پریویو کو دکھاتا ہے۔
- Zoom 100%: زوم آپشن اندر یا باہر لاتا ہے۔

فارمیٹنگ ٹول بار (Formatting Toolbar)

- S Shadow: ٹیکسٹ میں شیڈ دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔
- 12 Font-Size: فونٹ سائز کو سلیکٹ کرتا ہے۔
- I Italics: ٹیکسٹ کو اٹیلیک میں بدل دیتا ہے۔
- Left align: یہ ٹیکسٹ کو بائیں جانب قطار میں کر دیتا ہے۔
- Center-align: یہ ٹیکسٹ کو سینٹر میں کر دیتا ہے۔
- Bulleted list: ٹیکسٹ کے لیے بلیٹ لسٹ فراہم کرتا ہے۔
- A Decrease Font: فونٹ سائز کو کم کرتا ہے۔
- Demote: ٹیکسٹ کو ایک لیول نیچے کی طرف لاتا ہے۔
- Times New Roman آپ کوئی بھی فونٹ سلیکٹ کر سکتے ہیں۔
- B Bold: ٹیکسٹ کو جلی شکل میں دکھاتا ہے۔
- U Underline: ٹیکسٹ کو انڈر لائن کرتا ہے۔
- Right-align: یہ ٹیکسٹ کو دائیں جانب ایک قطار میں کر دیتا ہے۔
- Numbered List: سلیکٹ کیے گئے ٹیکسٹ کو نمبر لسٹ فارمیٹ میں رکھتا ہے۔
- A Increase Font: فانٹ سائز کو بڑھاتا ہے۔
- Promate: ٹیکسٹ کو ایک لیول اوپر کی طرف بڑھاتا ہے۔
- Animation Effects: یہ اینیمیشن افکٹس ڈائیلاگ باکس کو کھولتا ہے۔

ڈرائنگ ٹول بار (Drawing Toolbar)

ڈرائنگ ٹول بار میں ایسے بٹن ہوتے ہیں جو پاور پوائنٹ سے متعلق مختلف ڈرائنگ کے طریقوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ ذیل میں بہت سے بٹنوں کا کام (Functions) بتایا گیا ہے۔

● نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کمیونیکیشن اینڈ انفارمیشن ریسورسیز سی. ایس. آئی. آر یونٹ نے طلبہ اور عام شائقین میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے "سب کے لیے آئی ٹی سیریز" کے تحت ایسی کتابیں تیار کی ہیں جو انہیں کمپیوٹر سے متعلق بنیادی باتوں سے روشناس کراتی ہیں۔ قارئین "اردو دنیا" کے لیے اس سیریز کی کتاب "مائکروسافٹ پاور پوائنٹ" سے اقتباس پیش ہے۔

Select: آبجیکٹس کو سلیکٹ کرتا ہے۔

Rotat: آبجیکٹس کو روٹیٹ کرنے میں آپ کی مدد کرتا ہے۔

Line: لائنیں بناتا ہے۔

Arrow: ایرو ڈرا کرتا ہے۔

Rectangle: رکٹینگل ڈرا کرتا ہے۔

Oval: اول شیپ (بیضوی شکل) ڈرا کرتا ہے۔

Text Box: ایک مستطیل شکل بناتا ہے جس میں آپ اپنا ٹیکسٹ لکھ سکتے ہیں

WordArt: ورڈ آرٹ کی تخلیق کرتا ہے۔

Clipart: کلپ آرٹ انسرٹ کرتا ہے۔

FillColor: آبجیکٹ کے اندر سلیکٹ کیا ہوا رنگ بھرتا ہے۔

Line Color: لائن کو کلر کرتا ہے۔

FontColor: فونٹ کا کلر بدلتا ہے۔

Linestyle: لائنوں کا اسٹائل بدلتا ہے۔

Dashstyle: ڈیش اسٹائل کو بدلتا ہے۔

Arrow Style: ایرو اسٹائل کو بدلتا ہے۔

Shadow: شکل کے مطابق شیڈ دیتا ہے۔

3D آبجیکٹ کو مطلوبہ شکل عطا کرتا ہے۔

آفس اسسٹنٹ (Office Assistant)

ایم ایس آفس کی کنفیوز کرنے والی دنیا میں آفس اسسٹنٹ آپ کا بہترین ساتھی ہے کچھ بھی ٹائپ کیجیے اور پھر سوال کیجیے اور وہ آپ کو بالکل صحیح جواب دے گا۔ اسسٹنٹ کو سامنے لانے کے لیے F1 بٹن دبایئے اور اسے چھپانے کے لیے اس پر رائٹ کلک کیجیے اور Hide Assistant کو سلیکٹ کیجیے۔ درحقیقت یہ ایک طرح کا نمونہ ہے۔

ویوز (View)

پاور پوائنٹ میں پانچ قسم کے ویوز (Views) پائے جاتے ہیں۔ سلائڈ ویوز، آؤٹ لائن، سلائڈ سارٹر، نوٹس پیج اور سلائڈ شو ویوز۔

پاور پوائنٹ کو کھولنا اور اس کے مختلف ٹولس کی شناخت کرنا اب آپ کے لیے کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے۔

(جاری.....)

تعلیمی تشکیلِ نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

اسکول میں ایک ایسا ماحول بنانا جس میں بچوں کی فطری صلاحیتیں آزاد فضا میں نشو ونما پاکر ابھر سکیں، ان کی فطری نشو ونما کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ اساتذہ کی تربیت ایک خاص نہج پر کی جائے۔ اس کتاب میں انھی امور پر گفتگو کی گئی ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/96 روپے

خواجہ میر درد

مصنف: ظہیر احمد صدیقی

خواجہ میر درد اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کلام میں تصوف کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس کتاب میں درد کے حالاتِ زندگی، ان کی تصانیف، شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نوآموز طلبہ کے لیے ایک بہترین کتاب۔

صفحات: 64، قیمت: 14 روپے

عربی ادب کی تاریخ (جلد اوّل)

مصنف: ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

اس کتاب کے مقدمے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی نے صاحب کتاب کی صلاحیتوں کی داد ان لفظوں میں دی ہے— "ان کے ذہن و ذوق نے اس موضوع کو کچھ طور پر ہضم کر لیا ہے اور وہ اس میں محض نقال یا خوشہ چیں نہیں ہیں بلکہ اس سے لطف لینے میں اہل زبان کے شریک اور اہل ذوق کے ہمنفس اور ہمنوا ہیں۔ ان کی تحریر میں سنجیدگی بھی ہے، شگفتگی بھی، سلاست بھی، حلاوت بھی، مورخ کا احساس ذمہ داری بھی اور ایک صاحب ذوق کا انبساط و احتظاظ بھی۔"

صفحات: 352، قیمت: -/86 روپے

قدیم تامل ناڈو میں عربی و فارسی ادبیات کی چار سو سالہ تاریخ (جلد اول۔ عربی)

مصنف: کاوش بدری

جنوبی ہند میں اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کو بھی خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا۔ اس کتاب میں تمل ناڈو میں عربی زبان و ادب کے فروغ کا تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ نیز وہاں کے اہم علما کا تعارف، کتب خانوں اور نادر مخطوطات کی تفصیلات، اہم عربی مدارس اور عصرِ حاضر میں عربی تعلیم پر بھی گہری نظر ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 176، قیمت: -/98 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

عزیز احمد ہاشمی کوئز

سائنس

کوئز کے صحیح جوابات بھیجنے والے قارئین کو بالترتیب پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام دیا جائے گا۔ پہلا انعام 500 روپے، دوسرا انعام 300 روپے اور تیسرا انعام 200 روپے پر مشتمل ہے۔ انعام کے طور پر کونسل کی مطبوعات ارسال کی جائیں گی۔ آپ کے جوابات ہمیں اس مہینے کی 10 تاریخ تک موصول ہو جانے چاہئیں۔ (ادارہ)

(1) کون سا جاندار سرطان (Cancer) کی علامت ہے؟
(الف) بھیڑ (ب) کیکڑا
(ج) مچھلی (د) کبوتر

(2) کون سا جاندار ادویات کی مشق (Practice) کی علامت ہے؟
(الف) سانپ (ب) مگرمچھ
(ج) گلہری (د) فاختہ

(3) کون سا جاندار سب سے پہلے خلا میں بھیجا گیا؟
(الف) بڈّا (ب) طوطا
(ج) بندر (د) کتا

(4) جسم کے ہر خلیے میں کاربوہائیڈریٹ کی تکسید سے کیا خارج ہوتی ہے؟
(الف) توانائی (ب) روشنی
(ج) رطوبت (د) ان میں سے کوئی نہیں

(5) کس کاربوہائیڈریٹ سے آنتوں میں کھردرا پن پیدا ہوتا ہے؟
(الف) شکر (ب) سیلولوز
(ج) کاربن (د) تیزاب

(6) انسانی بدن کے کس حصے کا بڑا جز پروٹین ہوتا ہے؟
(الف) شریان (ب) ورید (رگ)
(ج) نسیج (Muscles) (د) جلد

(7) غذا کے ملے جلے سرچشمے ہیں؟
(الف) آکسیجن، کاربن، چربی (ب) چربی، پروٹین، کاربوہائیڈریٹ
(ج) وٹامن، آیوڈین (د) نائٹروجن، کاربن، پروٹین

(8) بیٹا آکزٹین (Beta Oaxotene) میں کون سا وٹامن ہوتا ہے؟
(الف) وٹامن اے (ب) وٹامن ڈی
(ج) پروٹین (د) وٹامن 12

(9) حیوانی جگر، انڈے کی زردی اور مکھن میں کون سا وٹامن ہوتا ہے؟
(الف) وٹامن کے (ب) وٹامن ای
(ج) پروٹین (د) وٹامن سی

(10) سرخ ذرات (Red Blood Carpesels) کی تعمیر کے لیے ضروری ہے:
(الف) وٹامن ایف (ب) وٹامن کے
(ج) وٹامن او (د) وٹامن بی 12

(11) کس سائنسداں نے 1774 میں آکسیجن کا پتہ لگایا؟
(الف) فرینکلین (ب) رونلڈ روس
(ج) جے بی پرسٹلے (د) کوچ

(12) آواز کی شدت کی اکائی ہے:
(الف) کلومیٹر (ب) وولٹ
(ج) لیٹر (د) ڈیسیبل (Decible)

(13) وٹامن ڈی کی کھوج کس نے کی؟
(الف) فریڈرک ہوپکنس (ب) گولاسکی
(ج) ٹوری سیلی (د) اسمتھ گورپن

(14) اوٹورt (Otorolhoea) نامی بیماری سے بدن کا کون سا حصہ متاثر ہوتا ہے؟
(الف) نروس سسٹم (ب) کان
(ج) ناک (د) سانس کی نلی

(15) کون سا خمیر (Enzayme) چھوٹی آنت سے نکلتا ہے؟

(الف) لائپز (ب) ٹرپسن (Trapson)

(ج) ایڈپسن (Edipsyn) (د) پیپسن (Pepsyn)

(16) سوڈیم بائی کاربونیٹ (NaHCO3) کھانے کا سوڈا کے استعمال سے وٹامن سی اور دوسرے کون سے وٹامن ضائع ہو جاتے ہیں؟

(الف) وٹامن بی کمپلکس (ب) وٹامن کے

(ج) وٹامن اے (د) ان میں سے کوئی نہیں

(17) چھاچھ کو تیل کے برتن میں رکھنے سے کیا پیدا ہوتا ہے؟

(الف) کڑواپن (ب) نمک

(ج) مطہر (د) تیزاب

(18) اکثر جراثیم (بیکٹریا) انسانوں کے لیے مضر ہوتے ہیں۔ وہ کیا پیدا کرتے ہیں؟

(الف) زہر (ب) دودھ

(ج) شہد (د) قوت

(19) Glycogen کے تنزل سے درمیانی حاصلات (Product) سے کیا بنتا ہے؟

(الف) اساس (ب) Lactic Acid

(ج) رس (د) Acetic Acid

(20) جراثیم کی وجہ سے ہونے والی آلودگی کو کم کرنے کے لیے کون سا اصول اپنایا جانا چاہیے؟

(الف) طبّی عمل (ب) حفظانِ صحت

(ج) ہوا کی صفائی (د) سورج کی روشنی

(21) جراثیم کے خاتمے کے لیے کیا استعمال کیا جاتا ہے تاکہ غذا کو محفوظ رکھا جا سکے؟

(الف) جراثیم کش پانی (ب) ڈیٹول

(ج) آیوڈین (د) Asepsis

(22) غذا کو محفوظ کرنے کے لیے غذا میں سائٹرک ایسڈ کے ساتھ اور کیا ملایا جاتا ہے؟

(الف) سوڈیم بنزوئٹ (Sodium Benzoate)

(ب) سوڈیم

(ج) کیلشیم

(د) سوڈیم آیوڈائیڈ

(23) انسان میں پائتھوجین بیکٹریا سے کون سا مرض ہوتا ہے؟

(الف) انفیکشن (عفونت) (ب) ذیابیطس

(ج) بخار (د) زکام

(24) کھانے کی غلط عادتوں کی وجہ سے دل کی کون سی بیماری ہوتی ہے؟

(الف) اسٹرپٹوکوکس (Streptococcus)

(ب) جزام

(ج) شکر

(د) شریانوں کا بند ہونا

(25) خون میں اخراجی مادہ پیشاب کی مقدار بڑھنے سے کون سا مرض ہوتا ہے؟

(الف) سرطان (Cancer) (ب) یورمیا (Uremia)

(ج) بلڈ پریشر (Pressure) (د) شکر (Diabetes)

(26) بچوں میں ہارمون کی کمی سے نمو رکنے کے علاوہ کون سی بیماری ہوتی ہے؟

(الف) دماغی بخار (ب) ہڈیوں کا بڑھنا

(ج) کریٹینزم (د) غدود (Adrena)

(27) سرطان کے عوامل کو کیا کہتے ہیں؟

(الف) پائیتھوجن (Pythogen) (ب) وٹامن بی

(ج) لنگرہنس (Langerhans) (د) کارسی نوجن

(28) پانی سے پھیلنے والی بیماری جو آنتوں پر برا اثر ڈالتی ہے اسے کہتے ہیں:

(الف) دمہ

(ب) نوعی تبدل (Mutation)

(ج) رطوبت

(د) گیسٹرو اینٹائٹیز (Gastro-entitis)

(29) انزائم غذا میں کیا پیدا کرتا ہے؟

(الف) فلاون (Flavin) (ب) نائسین (Niacin)

(ج) تیزاب (Acid) (د) تھائمن (Thiamin)

(30) مارگارین (Margarine) کو کیا کہتے ہیں؟

(الف) نباتاتی چربی (ب) انزائم

(ج) حیوانی چربی (د) گوشت

(31) چربی میں حل پذیر وٹامن کون سے ہیں؟

(الف) وٹامن اے، ڈی، ای، کے (ب) وٹامن سی، کے

(ج) وٹامن ای، ایف، سی (د) وٹامن اے، بی، سی

(32) بینائی کے لیے کون سا وٹامن اہم ہوتا ہے؟

(الف) وٹامن سی　　(ب) وٹامن کے

(ج) وٹامن ایف　　(د) وٹامن اے

(33) نباتی اور حیوانی اشیائے خوردنی میں پائے جانے والے وٹامن کا نام لکھیے۔

(الف) وٹامن بی　　(ب) وٹامن اے ریٹینل

(ج) وٹامن ڈی　　(د) وٹامن بی 12

(34) سلیکون کی وجہ سے ہونے والی بیماری کون سی ہے؟

(الف) تپ دق (T.B.)　　(ب) بھوراپن (Albinism)

(ج) دمہ　　(د) سلیکوسس (Silicosis)

(35) شراب کے کثرتِ استعمال سے کون سا مرض ہوتا ہے؟

(الف) سرہوسس (Cirhosis)　　(ب) گٹھیا

(ج) ایڈس　　(د) دل کی بیماری

□□□

ہمیں مارچ کے کوئز انعامی مقابلے کے متعدد جوابات موصول ہوئے۔ جانچ کے بعد درج ذیل حضرات کو بالترتیب اوّل، دوم اور سوم انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

1. **محمد طارق صدری سلفی**
فاضل پور، پوسٹ: شاہ پور بھگوتی، وایا وینی، سمستی پور، بہار

2. **محمد ساجد عبدالسعید قریشی**
بورگاؤں منجو، ضلع آکولہ، مہاراشٹر

3. **ساجد احمد قادری**
331/22، ذاکر نگر، نئی دہلی-25

انعام یافتگان کو ادارے کی طرف سے مبارک باد۔

آپ کے انعامات جلد ہی بذریعۂ ڈاک ارسال کر دیے جائیں گے۔

(ادارہ)

لڑھکتا پہیا

مصنف: آشا کمبھا، مترجم: ڈاکٹر صغریٰ مہدی

سرکس دیکھنا بچوں کا محبوب مشغلہ ہے۔ راسو اور کملا سرکس دیکھنے کے لیے ٹریکٹر پر سوار ہو کر شہر چلے۔ راستے میں ایک بے حد دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ تفصیلات جاننے کے لیے کتاب کا مطالعہ کیجیے۔

صفحات: 16، قیمت: -/15 روپے

ڈائن اور بھوت

مصنف: دیویکا رنگا چاری، مترجم: شمیمہ بیگم

بھوتوں سے عام طور سے بچے ڈرتے ہیں۔ رونی بھی ایک ایسا ہی لڑکا تھا جسے بھوت سے بڑا ڈر لگتا تھا لیکن جب ڈائن سے اس کی دوستی ہوئی تو یہ خوف جاتا رہا۔ ایک دلچسپ کہانی جو بچوں کو ضرور پسند آئے گی۔

صفحات: 16، قیمت: -/15 روپے

ڈاکیہ

مصنف: آر. کے. مورتی، مترجم: نجمہ نقوی

ایک بار جنگل کے راجا شیر نے ڈاکیے کے تقرر کے لیے ایک مقابلہ جاتی امتحان منعقد کیا جس میں جنگل کے بہت سے پرندوں اور جانوروں نے شرکت کی۔ لیکن اس میں کامیابی کنگارو کو ملی۔ یہ کامیابی اسے کیسے ملی، یہ جاننے کے لیے کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

صفحات: 16، قیمت: 15 روپے

پتھروں کے دل

مصنف: دشا کاچھی، مترجم: غلام حیدر

بچوں کو جادو منتر والی کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ "پتھروں کے دل" میں بھی ایسی ہی ایک کہانی بیان کی گئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کسی زمانے میں پتھروں کے بھی دل ہوا کرتے تھے لیکن ایک جادوگرنی نے اپنے جادو کے زور سے انھیں دل سے محروم کر دیا۔

صفحات: 16، قیمت: -/15 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے %40 کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

جاوید اقبال

کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو۔21

بڑھتے قدم

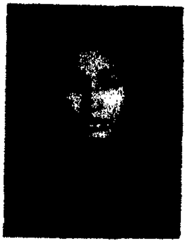

نور فاطمہ انصاری نے ابتدائی تعلیم الامین اورجواہر ہند ہائی اسکول، گلبرگہ سے حاصل کی۔ بی بی رضا پی یو کالج سے ہائر سیکنڈری کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ ٹی۔ٹی۔ آئی فار ویمن، گلبرگہ سے امتیازی نمبروں سے ڈی ایڈ کیا۔ دریں اثنا انہوں نے کونسل کا ایک سالہ ڈپلوما اِن کمپیوٹر اپلیکیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی۔ٹی۔پی۔ کورس حلیمہ کمپیوٹر سینٹر، گلبرگہ سے امتیازی پوزیشن کے ساتھ مکمل کیا اور اس کی بنا پر برسرِ روزگار ہیں۔ ان کا مختصر انٹرویو قارئین "اردو دنیا" کے لیے پیش ہے۔

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: عصرِ حاضر میں کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کرنا لازمی ہوگیا ہے۔ اس کے بغیر ہم وقت کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ کمپیوٹر پر براہِ راست ہمیں بیش بہا معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس لیے اس سائنس و ٹیکنالوجی کی صدی میں مجھے محسوس ہوا کہ کچھ ہی جس کی کمی ہے، چنانچہ میں نے حلیمہ ایجوکیشن سوسائٹی میں چلائے جا رہے قومی اردو کونسل کا ایک سالہ ڈپلوما کورس جوائن کیا۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: میری دانست میں قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دیگر سینٹروں سے کئی معاملوں میں بہت اچھے ہیں۔ کونسل نے اس مختصر عرصے میں نہ صرف ملک کے نوجوان اردو داں طبقے کو روزگار مہیا کرایا ہے بلکہ اردو کی صحیح معنوں میں ترویج کرنے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جا رہی ہے۔ اس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: میں صد فیصد مطمئن ہوں کیوں کہ یہاں تعلیم کا دارومدار تربیت پر ہے۔ بہترین طرزِ تعلیم، نصاب، طریقۂ تدریس ہی نہیں بلکہ ''عمدہ تربیت'' ہی کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں کی منفرد خصوصیت ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: اس کورس کی بنیاد پر میں مقامی اسکول میں جز وقتی طور پر کمپیوٹر ٹیچر ہوں جس سے میری تعلیم کے علاوہ دیگر اخراجات پورے ہوجاتے ہیں۔ ویسے مجھے کل وقتی طور پر کام کرنے کا آفر بھی مل رہا ہے لیکن گریجویشن کی تعلیم کی تکمیل میرے پیشِ نظر ہے۔ بے شک تمام ہندستانی اداروں میں قومی اردو کونسل سب سے زیادہ فعال ہے اور یہ فروغِ اردو کے مختلف پروگراموں پر کامیابی سے عمل کرتے ہوئے اپنے وجود کا احساس کرا رہی ہے۔ 6 سال کے مختصر عرصے میں کونسل نے ملک بھر میں قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ ملک میں آج اردو کی صورتِ حال بہتر ہوئی ہے اور اس میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ صاحب کی سربراہی میں قومی اردو کونسل کی غیر معمولی کارکردگی کا بہت اہم اور تاریخی رول ہے۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: ایسا لگ رہا ہے جیسے دنیا مختصر اور تیز رفتار ہوگئی ہے۔ فاصلے سمٹ گئے ہیں۔ وقت پر لگا کر اڑ رہا ہے اور دنیا میری مٹھی میں بند ہے۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خود اعتمادی اور خود انحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: بیشک میری خود اعتمادی اور خود انحصاری میں اضافہ ہوا ہے۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ یہ آپ کے لیے ایک بے حد مثبت چیز ہے۔ آپ اپنی اس انفرادیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتی ہیں؟

جواب: اس مقام پر کہ ''ہم سے زمانہ خود ہے، زمانے سے ہم نہیں'' ملٹی لنگول ہونے کی وجہ سے ہمیں ہر جگہ ترجیح دی جاتی ہے۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی، وہ آپ کے لیے بوجھ تو نہیں تھی؟

جواب: اس سے کم فیس پر کسی اور ادارے میں داخلہ ملنا ناممکن ہے۔ اتنی کم فیس پر اتنے اچھے کورسیز کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

سوال: آپ کے اساتذہ کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا رہا؟

جواب: میرے تمام اساتذہ کا رویہ مشفقانہ رہا۔ موثر تدریس کے ساتھ وہ اپنے پیشے کے ساتھ پوری ایمانداری برتتے ہیں اور میری یہ امتیازی کامیابی انھی اساتذہ کی محنت کا پھل ہے۔

□□□

فیروز عالم

رپورٹ

دہلی اردو کتاب میلہ

کتابوں سے قارئین کے کمزور ہوتے رشتے کو مضبوط بنانے اور لوگوں میں ذوقِ مطالعہ کو جلا دینے کے مقصد سے قومی اردو کونسل نے پانچ سال پہلے اردو کتاب میلے کا سلسلہ شروع کیا جو بے حد کامیاب ثابت ہوا۔ اسی سلسلے میں کونسل نے 27 فروری تا 6 مارچ 2005 جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشتراک سے انصاری آڈیٹوریم گراؤنڈ میں دہلی اردو کتاب میلے کا انعقاد کیا۔ میلے کا افتتاح کرتے ہوئے پلاننگ کمیشن کی ممبر محترمہ سیدہ حمید نے کہا کہ کسی بڑے مقصد کی تکمیل کے لیے پوری کمیونٹی کو Involve کر لینا ایک بڑا کام ہے، اور کونسل نے مختلف کتاب میلوں کے انعقاد کے ذریعے یہ بڑا کام سرانجام دیا ہے۔ ان کے ذریعے شائقین کتب کو نہ صرف مطلوبہ کتابیں بآسانی فراہم ہورہی ہیں بلکہ نئے نئے موضوعات پر شائع ہونے والی کتابوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہورہی ہیں۔ ان میلوں میں منعقد ہونے والے ثقافتی پروگرام بھی اپنی انفرادی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کے ذریعے اردو اور اردو کلچر سے غیر اردو داں حضرات کو بھی واقف ہونے کا موقع ملتا ہے۔

اس موقعے پر ڈائرکٹر قومی اردو کونسل ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے استقبالیہ خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے قومی اردو کونسل کا اشتراک نہ صرف کثیر الجہت ہے بلکہ خوش آئند بھی ہے۔ آج جامعہ ایک نئے منظرنامے سے جڑ رہا ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اس کوشش میں اپنا یوگدان دیں۔ اردو داں طبقے کو نئے ٹیکنالوجیکل منظرنامے سے جوڑنے کی کونسل کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے مزید کہا کہ اردو سے جڑا ہوا ڈسکورس نفرتوں کی پیداوار تھا۔ ایسے میں ہم نے اسے بدلنے کی سعی کی اور اردو اور اردو والوں کو نئے زمانے کی نئی سوغاتوں سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کی۔ ہمارا خواب تھا کہ ہر مدرسے کا بچہ اپنی شناخت کو محفوظ رکھتے ہوئے Dot.com سے آشنا ہو۔ اس کے لیے کونسل نے ملک بھر میں کمپیوٹر سینٹر کھولے اور اردو داں طبقے کو روزگار کے نئے مواقع فراہم کرائے۔ کمپیوٹر تعلیم کے علاوہ کونسل نے اردو زبان میں سائنس وٹیکنالوجی، سماجی علوم اور دیگر تمام مضامین پر کتابوں کی فراہمی پر زور دیا۔ اردو والوں کو مین اسٹریم میں لانے کا تصور یہی ہے کہ وہ نئی ٹیکنالوجی سے جڑیں اور نئے زمانے کی نئی سوغاتوں سے بہرہ ور ہوں۔

افتتاحی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے جناب شاہد مہدی نے اردو میں تمام مضامین کی کتابوں کی فراہمی کے لیے کونسل کی ستائش کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ دیگر اداروں کو بھی اس جانب توجہ دینی چاہیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کونسل نے اردو کو کمپیوٹر سے جوڑ کر ایک بڑا کام کیا ہے لیکن یہ ایجنڈا ابھی نامکمل ہے۔ اردو رسم خط کو انٹرنیٹ کے ذریعے کیسے سیکھا جائے، اس کی کوششیں جاری ہیں اور کونسل اور جامعہ کو اس کوشش کو کامیاب بنانا ہوگا۔

تقریب کے مہمانِ خصوصی پروفیسر مشیر الحسن نے میلے کے انعقاد کو خوش آئند قرار دیتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کیمپس میں قومی اردو کونسل کا بک اسٹال قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ مکتبہ جامعہ کے منیجر جناب شاہد علی خاں نے کہا کہ کتاب میلے اردو والوں کے لیے بے حد مفید ثابت ہورہے ہیں اور ان کے ذریعے لوگوں کو نئی نئی کتابوں کے بارے میں معلوم ہورہا ہے۔

جناب فیروز بخت احمد نے کہا کہ جب تک اردو سے محبت کرنے والے اور فروغ اردو کے مشن کو آگے بڑھانے والے موجود ہیں یہ زبان زندہ رہے گی۔ اس تقریب میں جناب فیروز بخت احمد کی کتاب ''اردو تعلیم اور اسکول'' کا اجرا ماہنامہ ''سائنس'' کے مدیر ڈاکٹر اسلم پرویز نے، جناب شہریار کی مرتبہ ''مضامین خلیل الرحمن اعظمی'' کا اجرا جناب شاہد مہدی اور جناب گلزار کے تحریر کردہ ٹی وی سیریل کے منظرنامے ''مرزا غالب'' کا اجرا ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے کیا۔ اس تقریب کی نظامت کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ نے کی۔ آخر میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے تمام مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

28 فروری کو تین بجے دن میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اپنا گروپ نے ''چلتا ہے یار'' کے عنوان سے ایک ڈرامہ پیش کیا جس میں نوجوان نسل کی بے روزگاری اور نشہ خوری کی عادتوں اور سماج کی دیگر برائیوں پر گہرا طنز کیا گیا تھا۔ جناب محمد شاہد کے تحریر کردہ اس ڈرامے کے ہدایت کار جناب اسلم خاں تھے۔ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ کے طالب علم جاوید احسن نے اس موقعے پر مونو ایکٹنگ سے حاضرین کو محظوظ کیا۔

شام پانچ بجے شام غزل کا انعقاد کیا گیا جس میں استاد ضمیر احمد خاں،

شلپا شرما، ذیشان اور فیصل اسلام نے غزلیں پیش کیں۔ ان تمام پروگراموں کی نظامت جناب عمیر منظر نے کی۔

میلے کے دوران اردو کے منفرد رسالے ''اپچین'' (جو پچھلے دو سال سے شائع ہورہا ہے) کی طرف سے کوئز انعامی مقابلے کا انعقاد کیا گیا جس میں صحیح جواب دینے والے پانچ طالب علموں کو انعامات سے نوازا گیا۔ انعامی مقابلے کا یہ سلسلہ کتاب میلے کے آخری دن تک جاری رہا۔

یکم مارچ کو ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر مظفر حنفی نے کی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن بطور مہمانِ خصوصی شریک ہوئے۔ ممتاز شاعر اور صحافی جناب مخمور سعیدی نے اس موقعے پر استقبالیہ خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ قومی اُردو کونسل اپنے قیام کے بعد ہی سے اُردو زبان و ادب اور اُردو کلچر کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں رہی ہے۔ ایک بہت اہم کام جو موجودہ دور میں کسی بھی زبان کی بقا کے لیے ضروری ہے وہ ہے عصری تقاضوں پر لبیک کہنا۔ کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی سے رشتہ قائم کیے بغیر موجودہ ماحول میں کوئی زبان ترقی نہیں کرسکتی۔ اردو کونسل نے اس سلسلے میں جو کام کیا اس کی اہمیت آج بھی محسوس کی جارہی ہے اور کل اور زیادہ محسوس کی جائے گی۔ اس وقت تک ملک کے طول وعرض میں 245 کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر کونسل قائم کرچکی ہے، جن سے ہزار ہا طلبہ و طالبات ٹریننگ لے کر نکل رہے ہیں اور روزگار کے نئے مواقع انھیں حاصل ہورہے ہیں۔ اب بعض اُردو والوں کی یہ شکایت قصۂ پارینہ بن چکی ہے کہ ہمارے بچے اُردو سیکھ کر کیا کریں گے، اُردو سے تو روزگار حاصل ہوتا نہیں۔ اُردو والوں میں خود اعتمادی کی یہ بحالی کونسل کا تاریخی کارنامہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اُردو کتاب میلوں کے آغاز کا سہرا بھی اُردو کونسل ہی کے سر بندھتا ہے۔ پہلا اُردو کتاب میلہ آج سے چار سال قبل دہلی میں ہی لال قلعہ گراؤنڈ میں منعقد ہوا تھا اور بہت کامیاب رہا تھا۔ کونسل ممبئی، سرینگر اور حیدرآباد میں بھی کل ہند اُردو کتاب میلے منعقد کرچکی ہے۔ کتاب میلوں کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے جناب مخمور سعیدی نے کہا کہ کتابیں کسی بھی قوم کا حافظہ ہوا کرتی ہیں اور جو قوم اپنا حافظہ کھو بیٹھے، اس کے وجود پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔ انھوں نے اُردو داں طبقے کو میلے کے مختلف اسٹالوں سے اپنی پسند کی کتابیں خریدنے اور اُردو زبان و ادب سے اپنے لگاؤ کا عملی ثبوت دینے کی گزارش کی۔

بعد ازاں مشاعرے کا آغاز ہوا جس کی نظامت جناب معین شاداب نے بحسن وخوبی انجام دی۔ مشاعرے میں جن شعرا نے اپنے کلام سے محظوظ کیا ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

جناب عمیر منظر، محترمہ سنیتا رینا، جناب سریندر شجر، جناب ماجد دیوبندی، جناب سہیل احمد فاروقی، جناب فرحت احساس، محترمہ نسیم مخموری، جناب زبیر رضوی، جناب مخمور سعیدی، جناب کمال احمد صدیقی، جناب حیات لکھنوی، جناب شہریار، جناب رفعت سروش اور جناب مظفر حنفی۔

آخر میں قومی اُردو کونسل کے پرنسپل پبلیکیشن آفیسر ڈاکٹر آر۔ کے۔ بھٹ کے شکریے پر مشاعرے کا اختتام عمل میں آیا۔

2/مارچ کو ایک تقریری مقابلہ بعنوان ''نئی تبدیلیوں کے تئیں اقلیتوں کا رویہ مثبت ہے'' منعقد کیا گیا جس میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دہلی یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات نے کثیر تعداد میں حصہ لیا۔ اس موقعے پر مہمانِ خصوصی ہندی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور ہندی کے مشہور و معروف شاعر اور ادیب جناب اشوک باجپئی تھے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، ڈائرکٹر قومی اُردو کونسل نے کہا کہ اس کثیر لسانی ملک میں متعدد قسم کی اقلیتیں اپنے اپنے رنگارنگ تشخص سے جہاں ہندستان کی جمہوری روایات کی آبیاری کرتی ہیں وہیں ان کی ترویج و ترقی کے لیے حکومت ہند کی جانب سے اٹھائے گئے اقدامات پر بھی لبیک کہتی ہیں۔ جس مذہب کی بنیاد فلسفۂ کن فیکون پر قائم ہو وہاں کسی چیز پر ٹھہراؤ نہیں آسکتا۔ اقلیتوں میں تبدیلیوں کے تئیں مثبت رویہ ہے اور وہ اپنے تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے نئے زمانے کی نئی سوغاتوں سے بہرہ ور ہورہے ہیں۔ اس تقریری مقابلے کے بعد جج صاحبان پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی اور ڈاکٹر اسلم پرویز نے فرحان بیگ (دہلی یونیورسٹی) کو اوّل، محمد مبشر حسین (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کو دوئم، مہمنہ خاتون (جے۔این۔یو) کو سوئم اور نوشاد عالم (جے۔این۔یو) کو حوصلہ افزائی کے انعام کا مستحق قرار دیا۔

تقریری مقابلے کے بعد ڈاکٹر رخشندہ جلیل اور جناب نوید حامد نے اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر ریزیڈنٹ کمشنر (جموں وکشمیر) جناب پرویز دیوان نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

جناب اشوک باجپئی نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح اکثریتی فرقے کے تمام لوگ ایک جیسے نہیں ہیں اسی طرح اقلیتی فرقے کے بھی افراد بھی یکساں نہیں ہیں اور کسی بھی تبدیلی کے تئیں پوری اکثریت یا سبھی اقلیتوں کا رویہ یکساں نہیں ہوسکتا۔ ہندستان کی اقلیت خاص طور سے

مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ 900 برسوں سے یہاں آباد ہیں۔ یہاں کی مٹی، ہوا اور پانی پر ان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کسی اور کا۔ نئی تبدیلیوں کے تئیں اقلیتوں کے رویے کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ہندوؤں یا دیگر مذہبی فرقوں کا ان تبدیلیوں کے تئیں کیا رویہ ہے۔

اس موقعے پر دو کتابوں کی رسمِ اجرا بھی انجام دی گئی۔ جناب پرویز دیوان کی کتاب ''اللہ کے مقدس نام'' جسے قومی اُردو کونسل نے شائع کیا ہے کا اجرا پروفیسر مشیر الحسن، وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کیا جب کہ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ کی تیار کردہ اُردو سکھانے کی کتاب "Urdu Script through English" کی رسمِ اجرا جناب اشوک باجپئی نے انجام دی۔

''ممتاز شخصیت سے ملاقات'' پروگرام کے تحت مشہور و معروف صحافی جناب سعید نقوی سے ملاقات کا پروگرام بھی منعقد کیا گیا۔ مہمان صحافی کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے کہا کہ جناب سعید نقوی اُردو تہذیب کے علم بردار ہیں۔ وہ روایت شکن بھی ہیں اور روایت کے پاسدار بھی۔ بین الاقوامی معاملات پر ان کو دسترس حاصل ہے۔ جناب سعید نقوی نے اس موقعے پر اپنے مختصر حالاتِ زندگی اور صحافت سے جڑے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہندستانی میڈیا کو بین الاقوامی معاملات پر نظر رکھنی چاہیے اور دوسرے ممالک میں اپنے نیوز بیورو قائم کرنے چاہئیں۔ جب تک ہمارے ہاتھ میں میڈیا نہیں ہوگا، ہم صحیح حقائق سے اپنے عوام کو روشناس نہیں کرا سکیں گے۔ آخر میں جناب سعید نقوی سے مختلف سوالات بھی کیے گئے جن کے انھوں نے تشفی بخش جوابات دیے۔ پروفیسر اختر الواسع کے شکریے پر پروگرام کا اختتام ہوا۔

کتاب میلے کے پانچویں دن ''اردو سنگیت اور محمد رفیع کے نغمے'' کے زیرِ عنوان ایک مذاکرے کا انعقاد عمل میں آیا جس کے مہمانِ اعزازی مشہور و معروف فلم ڈائرکٹر اور پروڈیوسر جناب مہیش بھٹ تھے۔ پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے کہا کہ اردو دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے اور اس کے فروغ میں میڈیا نے زبردست رول ادا کیا ہے۔ اردو زبان کے فروغ میں فلم میڈیا کی گراں قدر خدمات کے مدِ نظر یہ سیمینار منعقد کیا گیا ہے۔

مہیش بھٹ نے اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''اُردو مسلمانوں کی نہیں، ہندستان کی زبان ہے اور میں جذباتی طور پر اس سے بہت قریب ہوں۔ یہ میری مادری زبان ہے۔ قومی اُردو کونسل نے اس زبان کے احیا کی جو تحریک شروع کی ہے اس سلسلے میں فلمیں بھی بے حد معاون ثابت ہوسکتی ہیں۔ ہمیں اُردو کو اس کا جائز مقام دلانے کی کوشش کرنی ہوگی۔ یہ میری بدنصیبی ہے کہ میں اُردو رسم الخط سے ناواقف ہوں اور آج میں کونسل کی طرف سے چلائے جا رہے اُردو ڈپلوما کورس میں داخلہ لے رہا ہوں۔'' اس موقعے پر قومی اُردو کونسل کے وائس چیئر مین جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ اُردو ہندستان کی مشترکہ تہذیب کی امین ہے اور اسے ہندستان کے تمام مذاہب کے لوگوں کی زبان ہونے کا فخر حاصل ہے۔

محمد رفیع کی گائیکی پر ممتاز فلم ڈائرکٹر جناب اردن کول، روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' کے ایڈیٹر جناب عزیز برنی، ''ذہنِ جدید'' کے ایڈیٹر جناب زبیر رضوی اور آل انڈیا ریڈیو کے جناب انوار احمد خاں نے اظہارِ خیال کیا۔ اس پروگرام میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طالب علموں کے علاوہ مشہور گلوکار دیپا شیش چکرورتی نے محمد رفیع کے نغمے پیش کیے۔

اس موقعے پر جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب ''تنقیدی افکار'' (ناشر: قومی اُردو کونسل) کا اجرا جناب زبیر رضوی نے، ''معلم تہذیب خواجہ غلام السیدین'' (مرتبہ پروفیسر اختر الواسع اور فرحت احساس)، ''عظمتِ رفتہ کا سراغ'' (مصنف: محمد شیش ادریس تیمی)، ''تعلیمی نفسیات کیا ہے'' (مصنفہ: عصمت جہاں صدیقی) کا اجرا پروفیسر مشیر الحسن، وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ''ہند مسلم تعلقات کی خوشگوار یادیں'' (مصنف: ڈاکٹر محمد احمد، ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی) کا اجرا جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے کیا۔

4 مارچ کو ایک پینل ڈسکشن بعنوان ''ماس میڈیا میں اُردو طلبہ کے لیے مواقع اور امکانات'' منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بی۔ بی۔ سی کے سابق نامہ نگار جناب قربان علی نے کہا کہ آج کل ماس میڈیا میں الیکٹرانک میڈیا کی ہوڑ سے روزگار کے مواقع دن بدن بڑھ رہے ہیں کیوں کہ ہر چینل بالخصوص ای۔ ٹی۔ وی (اُردو)، سہارا ہے اور جین ٹی۔ وی وغیرہ اُردو میں خبریں نشر کر رہے ہیں جن کے لیے انھیں صحیح اُردو تلفظ والے نیوز ریڈر درکار ہیں۔ اگر اُردو کے طالب علم اُردو زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی اور ہندی کی بھی خاطر خواہ واقفیت رکھتے ہیں تو انھیں آسانی سے نوکری مل سکتی ہے۔ دوسرے مقرر جناب عبید صدیقی نے بھی قربان علی کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ آج کے پروفیشنل ماحول میں اُردو بیک گراؤنڈ والے طلبہ و طالبات کی انگریزی اور ہندی سے واقفیت ضروری ہو گئی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اُردو تعلیمی

نصاب کو عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہے تا کہ اس کی بنیاد پر اُردو طلبہ اپنے آپ کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرسکیں۔

سینٹرل پروڈکشن سینٹر، دوردرشن کے ڈائرکٹر جناب بشارت احمد نے کہا کہ آج اُردو بولنے والوں کو اپنے آپ روزگار کے اسکوپ پیدا کرنے ہوں گے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ گذشتہ برسوں میں اُردو کے تئیں جو تعصب تھا وہ اب ختم ہو چکا ہے اور اس کا بیّن ثبوت اُردو قارئین کا وہ طبقہ ہے جو اُردو شعر و ادب کو ہندی اور انگریزی رسم الخط کے توسط سے پڑھتا ہے۔

ممتاز صحافی اور دہلی اُردو اکیڈمی کے وائس چیئرمین جناب م۔ افضل نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اُردو دنیا کی تمام زبانوں میں سب سے میٹھی زبان ہے۔ اس کی ترویج و ترقی کے لیے ہمیں ذاتی طور پر تگ و دو کرنی چاہیے کیوں کہ کوئی بھی زبان صرف حکومت کی حمایت پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ کونسل کے پرنسپل پبلیکیشن آفیسر ڈاکٹر آر. کے. بھٹ نے اس پروگرام کی نظامت کی۔

اس موقعے پر نیو ہورائزن اسکول کی استاد محترمہ وسیم راشد کی کتاب ''نئی اُردو'' کا اجرا جناب م۔ افضل نے کیا۔

5/مارچ کو انصاری آڈیٹوریم کے پاس اوپن ایئر تھیٹر میں ایک فی البدیہہ تقریری مقابلے کا انعقاد کیا گیا۔ اس نشست کے مہمان خصوصی تھیٹر کی مشہور و معروف شخصیت جناب ایم۔ کے۔ رینا نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آرٹسٹ کا کام صرف آرٹ تخلیق کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اس کو سماج کے ساتھ چلنا ہوتا ہے اور ایک ڈاکٹر کی طرح سماج کی سرجری بھی کرنی ہوتی ہے۔ اس سے قبل مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے کہا کہ قومی اردو کونسل نے کتابوں کی نمائش اور فروخت کے ساتھ ساتھ اردو کے ساتھ جڑی ہوئی ہر کلی کو کھلانے کی کوشش بھی کی ہے تا کہ اردو کا چمن ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے۔ اردو والوں کو میڈیا، ٹیکنالوجی اور روزگار سے جوڑنے کے لیے قومی اردو کونسل ایک بڑے پلیٹ فارم کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے جس سے ہر ایک اردو والے کو استفادہ کرنا چاہیے۔

گوری شنکر رینا نے مہمان خصوصی ایم۔ کے۔ رینا کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ گزشتہ 33 برسوں سے وہ تھیٹر، ٹیلی سیریل اور فلم سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے 100 سے زائد ڈراموں کی ہدایت کی ہے جن میں کبیرا کھڑا بازار میں، اندھا یگ، جسما اوڈھن، کرماں والی، بانگ ڈبائی، منو وغیرہ اہم ہیں۔ انھیں بہت سے انعامات سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

جناب کمال فاروقی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اردو کو ماضی میں جب معاشیات سے جوڑنے کی کوشش اور بات کی جاتی تھی تو ان کو سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا تھا لیکن جب آج کونسل اردو کو ٹیکنالوجی، میڈیا، پروفیشنلزم اور روزگار کے دوسرے ذرائع سے جوڑنے کی کوشش کر رہی ہے تو اس پر اردو والے لبیک کہہ رہے ہیں۔ اس تقریری مقابلے میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی اور جامعہ ہمدرد کے طلبہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس میں محمد مبشر حسین کو پہلا، نجم الہدیٰ کو دوسرا، محمد ثمر الہدیٰ کو تیسرا اور وکیل احمد کو کنسولیشن انعامات ملے۔

اس موقعے پر ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کی 'حقائق اسلام'، سلطان احمد اصلاحی کی 'اسلام اور آزادیِ فکر و عمل' اور ندا فاضلی کی 'شہر میرے ساتھ چل تو' کتابوں کی رسم اجرا ایم۔ کے رینا کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ 'کتاب نما' کے خصوصی شمارے 'مجتبیٰ حسین: فن اور شخصیت' مرتبہ: ڈاکٹر محمد کاظم کا اجرا ڈاکٹر خالد محمود اور 'ادویہ معدنیہ' مصنفین: ڈاکٹر مستحسن، ڈاکٹر عباس علی کا اجرا ڈاکٹر آر. کے. بھٹ، پرنسپل پبلی کیشن آفیسر قومی اردو کونسل نے کیا۔ فرید بک ڈپو، دہلی کی شائع کردہ پانچ کتابوں'' بابری مسجد شہادت سے قبل'' اور'' بابری مسجد شہادت کے بعد'' (مرتب: محمد عارف اقبال) کا اجرا بدست ڈاکٹر خالد محمود،'' اُردو سکھانے کا نیا طریقہ'' (مصنف: ڈاکٹر تنویر حسین) کا اجرا بدست ڈاکٹر نعمان خاں،'' کلام نظیر اکبرآبادی'' (مرتب: فاروق ارگلی)،'' دس پاکستانی شاعر'' (مرتب: فاروق ارگلی) اور'' جہاد کے بعد'' (مصنف: لوح فیلڈ مین، اُردو ترجمہ: ڈاکٹر نفیس صدیقی) کا اجرا جناب شاہد علی خاں منیجر مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ اور محترمہ شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر، قومی اردو کونسل نے کیا۔

شام میں گائکی کی دنیا کی مشہور و معروف ہستی مدن گوپال سنگھ نے اپنے گروپ کے ساتھ صوفیانہ کلام پیش کیا۔

6/ مارچ کو کتاب میلے کی اختتامی تقریب منعقد ہوئی جس سے خطاب کرتے ہوئے مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے کہا کہ'' ملک کو متحد رکھنے اور اس کی بھرپور ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اُردو کو پھلنے پھولنے کا پورا موقع ملے اور اسے فروغ دیا جائے کیونکہ یہ ایسی زبان ہے جو ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کی ترجمان ہے اور اس سے پورے ملک میں باہمی میل جول، قومی ہم آہنگی اور سیکولر فکر کو مضبوطی ملتی ہے۔ اُردو ملک میں امن، خیر سگالی اور جذبۂ ایثار کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔'' پرہجوم جلسے میں سامعین کی موجودگی سے متاثر ہو کر جناب ارجن سنگھ نے کہا کہ یہاں کا ماحول دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں اُردو کتنی مقبول ہے اور لوگوں کو اس

سے کتنی زیادہ دلچسپی اور محبت ہے۔ مرکزی وزیر نے کہا کہ اُردو کی اہمیت کے پیش نظر اس کے فروغ کے لیے ان کی وزارت ترجیحی بنیاد پر کام کرتی ہے اور اس کے لیے وسائل فراہم کرنے میں کسی بھی طرح کی کمی نہیں کرتی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے اس ادارے کی انتظامیہ خاص طور سے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کی ستائش کی اور ساتھ ہی وعدہ کیا کہ اردو کے فروغ کے لیے ان کی وزارت ہمیشہ کی طرح آئندہ بھی ہر ممکن تعاون جاری رکھے گی۔

اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ذکر کرتے ہوئے جناب ارجن سنگھ نے کہا کہ گاندھی جی کے زمانے سے لے کر اب تک ملک کے تمام قومی رہنماؤں نے اس ادارے کے فروغ اور ترقی میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ملک کے ہر طبقے کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے اس طرح کے مزید ادارے قائم کرنے ہوں گے تاکہ ہمارا ملک ترقی کی راہ پر تیزی سے آگے بڑھ سکے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ یہاں کتاب میلے کے انعقاد سے مجھے بے انتہا خوشی ہوئی ہے کیونکہ اس سے اُردو قارئین کو خاطر خواہ استفادہ کرنے کا موقع ملا ہے جو اُردو کے فروغ کے لیے انتہائی اہم ثابت ہوگا۔ اُردو کتاب میلے کے خوش اسلوبی سے انعقاد پر اظہار اطمینان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہماری خواہش ہے کہ اس طرح کے میلوں کا اہتمام بار بار کیا جائے اور اسے جامعہ کا مستقل فیچر بنایا جائے۔

پروفیسر سیف الدین سوز نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ جب میں یہاں آیا تو آپ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ اُردو زبان ابھی زندہ ہے اور یہاں اس کی داخلی قوت کا اظہار ہو رہا ہے۔ پروفیسر سوز نے جناب ارجن سنگھ سے گذارش کی کہ اُردو کونسل کی وسیع خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے بجٹ میں اضافہ کیا جائے۔ کونسل کی موجودہ گرانٹ جو گیارہ کروڑ روپیہ ہے وہ اس کے وسیع کاموں کے پیش نظر بے حد کم ہے۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ اردو کے فروغ کے لیے کونسل کا دائرہ وسیع کر کے اس کے تحت مزید چار ریجنل ادارے قائم کیے جائیں تاکہ ملک کے دیگر حصوں میں اُردو بولنے والے ان سے استفادہ کر سکیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ حکومت کو ایک کمیٹی بنا کر اردو کی ترقی کے لیے امکانات تلاش کرنے چاہئیں اور جن ریاستوں میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے وہاں اسے لازمی اور اختیاری مضمون کے طور پر پڑھنے کی سہولت فراہم کرائی جائے۔ یہ کہتے ہوئے کہ جنگِ آزادی میں اُردو زبان کا گراں قدر رول رہا ہے انھوں نے کہا کہ اُردو کو مسلمانوں کی زبان کہنا اس کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اردو تمام مذاہب کی زبان ہے۔

قبل ازیں قومی اُردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے افتتاحی تقریب کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ بدلتے ہوئے نئے منظرنامے میں نئے ہندستان کی تعمیر کے ایجنڈے کو آگے بڑھانے اور سماجی نابرابری کو ختم کرنے کے لیے جناب ارجن سنگھ صدق دلی سے مصروف ہیں۔ اُردو کونسل کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کونسل 1996 میں قائم کی گئی تھی۔ اسی وقت سے یہ ادارہ مختلف انداز میں اُردو کے فروغ کے لیے بھرپور کام کر رہا ہے۔ اس وقت کونسل کے 245 کمپیوٹر ایپلیکیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی۔ ٹی۔ پی سینٹر چل رہے ہیں جن میں اٹھارہ ہزار طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جامعہ ملیہ میں منعقدہ اس کتاب میلے میں مجموعی طور پر تقریباً 20 لاکھ روپے کی کتابیں فروخت ہوئیں۔

اختتامی تقریب کے مہمانِ اعزازی ہندستان میں امریکی سفارت خانے کے شعبۂ اطلاعات سے شائع ہونے والے اُردو میگزین ''اسپین'' کے چیف ایڈیٹر مائیکل اینڈرسن نے اس موقعے پر اپنے رسالے کی طرف سے طلبہ کو ایوارڈ سے نوازا۔

جلسے کے آخر میں کونسل کی طرف سے چلائے جا رہے کمپیوٹر سینٹروں میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہونے طلبہ و طالبات کو اسناد و انعامات تقسیم کیے گئے۔ اس موقعے پر فرید بک ڈپو کو اسٹال کی بہتر آرائش کے لیے، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کو مختلف موضوعات پر سب سے زیادہ کتابوں کے لیے اور ایجوکیشنل بک ہاؤس کو سب سے زیادہ کتابیں فروخت کرنے کے لیے انعام سے نوازا گیا۔

اختتامی جلسے میں بڑی تعداد میں طلبہ و طالبات اور سامعین نے شرکت کی جن میں کرناٹک کے سابق گورنر مسٹر خورشید عالم خاں، راشٹریہ سہارا (اُردو) کے جوائنٹ ایڈیٹر مسٹر عزیز برنی اور فرینڈس فار ایجوکیشن کے چیئرمین مسٹر فیروز بخت احمد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

□□□

اردو خبرنامہ

قومی اردو کونسل کی تشکیلِ نو

● نئی دہلی، 2 /مارچ۔ قومی اردو کونسل جو پچھلے کئی برسوں سے اردو کے فروغ میں ایک کلیدی رول ادا کر رہی ہے اور جسے اردو زبان کی ترویج وترقی کے لیے قومی مقتدرہ کی حیثیت حاصل ہے، حکومت ہند نے اس کی تشکیلِ نو کا اعلان کیا ہے۔ مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نوتشکیل شدہ کونسل کے چیئرمین اور جناب شمس الرحمن فاروقی نائب چیئرمین ہوں گے۔

حکومت ہند نے قومی اردو کونسل کو ہندستان بھر میں فروغ اردو کے مختلف پروگراموں میں تال میل پیدا کرنے اور ان کی نگرانی کرنے والے ادارے کے طور پر قائم کیا ہے۔ کونسل ایک ایسے مقتدرہ کے طور پر کام کرتی ہے جو پرائمری اور سیکنڈری سطح پر اردو ذریعۂ تعلیم کے اداروں کے لیے تعلیمی اور تکنیکی مواد فراہم کرتی ہے تاکہ اردو ذریعۂ تعلیم کے ادارے اور ان کا نصاب قومی معیار اور قومی مقاصد سے ہم آہنگ ہوسکیں۔ نوتشکیل شدہ کونسل کے اراکین اور مجلسِ منتظمہ کی فہرست درج ذیل ہے:

چیئرمین: جناب ارجن سنگھ، مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل

نائب چیئرمین: جناب شمس الرحمن فاروقی

قومی اہمیت کے حامل اردو رضاکار اداروں کے نمائندے:

1. پروفیسر قمر رئیس، انجمن ترقی پسند مصنفین، دہلی
2. جناب پی۔ اے۔ انعامدار، پونے

اردو اسکالر:

1. جناب گلزار، ممبئی
2. جناب گوہر رضا، دہلی
3. پروفیسر شمیم حنفی، دہلی
4. جناب ندا فاضلی، ممبئی
5. جناب شہریار، علی گڑھ
6. پروفیسر صادق، دہلی

اردو کی ترویج وترقی میں دلچسپی رکھنے والی اہم شخصیتیں:

1. جناب حبیب تنویر، بھوپال
2. جناب اختر سعید مرزا، ممبئی
3. جناب زبیر رضوی، دہلی
4. جناب سعید نقوی، دہلی
5. جناب علی جاوید، دہلی
6. ڈاکٹر رفیق زکریا، ممبئی

کمشنر برائے لسانی اقلیت یا ان کا نمائندہ

محکمۂ ثانوی واعلا تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند کے دو نمائندے:

1. محترمہ بیلا بنرجی، جوائنٹ سکریٹری (لینگویجز)
2. جناب ایس۔ کے۔ رائے، جوائنٹ سکریٹری اینڈ فنانشل ایڈوائزر، وزارت ترقی انسانی وسائل

قابلِ لحاظ اردو آبادی والے صوبوں اور مرکزی علاقوں کے نمائندے:

1. جناب رحمن راہی، جموں وکشمیر
2. جناب اقبال مجید، بھوپال، مدھیہ پردیش
3. جناب اسد زیدی، گوڑگاؤں، ہریانہ
4. پروفیسر نسیم بھاٹیہ، وائس چانسلر جودھ پور یونیورسٹی، راجستھان
5. چیئرمین، کمیشن برائے سائنسی اور تکنیکی اصطلاحات، نئی دہلی
6. ڈائرکٹر، سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز، میسور
7. ڈائرکٹر، سینٹرل ہندی ڈائرکٹوریٹ، نئی دہلی
8. ڈائرکٹر، کیندریہ ہندی سنستھان، آگرہ
9. ڈائرکٹر نیشنل کونسل فار ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی
10. یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کا نمائندہ
11. ہندستانی کونسل برائے ثقافتی تعلقات (ICCR) کا نمائندہ
12. وزارت قانون کا نمائندہ۔

کونسل کے ایگزیکیٹو بورڈ کے چیئرمین جناب ارجن سنگھ، مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند اور نائب چیئرمین جناب شمس الرحمن فاروقی ہوں گے۔ ایگزیکیٹو بورڈ کے اراکین میں محترمہ بیلا بنرجی، جوائنٹ سکریٹری (لینگویجیز)، جناب ایس۔ کے۔ رائے، جوائنٹ سکریٹری اینڈ فنانشل ایڈوائزر، وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلا تعلیم، حکومتِ ہند، پروفیسر قمر رئیس، جناب ندا فاضلی، جناب علی جاوید، پروفیسر نسیم بھاٹیہ، جناب اقبال مجید اور قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ شامل ہیں۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے کونسل کی تشکیلِ نو پر اطمینان کا اظہار کرتے

ہوئے امید ظاہر کی ہے کہ ان نئے اراکین کی رہنمائی میں فروغ اردو کے کاز کو مزید تقویت ملے گی اور کونسل کے منصوبوں کو کامیابی سے عملی جامہ پہنایا جا سکے گا۔

''مولانا عرشی شخصیت اور فن'' سیمینار

● نئی دہلی، 27 فروری۔ ''مولانا امتیاز علی خاں عرشی بلند پایہ محقق، نقاد اور ایک معتبر شاعر کی حیثیت سے اردو دنیا میں ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ ان کے تحقیقی وعلمی کاموں کو ژرف نگاہی کے ساتھ مزید کھنگالنے کی ضرورت ہے۔'' ان خیالات کا اظہار مولانا عرشی میموریل کمیٹی اور اردو اکادمی دہلی کی طرف سے غالب اکادمی میں مشترکہ طور پر منعقدہ سیمینار ''مولانا عرشی، شخصیت اور فن'' میں دانشوروں نے کیا۔ اسکالروں نے مزید کہا کہ مولانا عرشی کے کاموں کی وقعت اور خدمات کے معیار کو قائم کرنے کے لیے جس لگن، سنجیدگی اور یکسوئی کی ضرورت ہے اس کے لیے اردو کی تنظیموں کو آگے آنا چاہیے۔ سیمینار کے پہلے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے گلزار دہلوی نے مولانا عرشی کی گراں قدر خدمات کو سراہا۔ ڈاکٹر خالد محمود نے انھیں عظیم المرتبت محقق اور شاعر قرار دیا۔ ڈاکٹر معتصم عباسی نے مولانا کی شاعرانہ عظمت کا ذکر کیا۔ پہلے اجلاس میں ڈاکٹر ابرار رحمانی، ڈاکٹر ابن کنول، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر شیخ عقیل احمد اور اسد رضا نے مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ مولانا عرشی کی قدر و قیمت کا تعین 21 ویں صدی میں پہلے سے زیادہ اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر صادق، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی اور پروفیسر اختر الواسع نے کی اس اجلاس میں ڈاکٹر علیم اشرف، ڈاکٹر مولا بخش اسیر، ڈاکٹر شہزاد انجم، ڈاکٹر زہرہ عرشی، ڈاکٹر اخلاق احمد آہن، ڈاکٹر معتصم عباسی اور ڈاکٹر محمد اسحاق فلاحی نے مقالات پڑھے اور ڈاکٹر اقتدار محمد خاں نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر مشتاق صدف نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ سیمینار کے تیسرے اور اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے کی اور ممتاز صنعت کار اشوک چوہان بطور مہمانِ خصوصی شریک ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا عرشی گنگا جمنی تہذیب کی علامت تھے۔ مولانا عرشی کے صاحبزادے ممتاز عرشی نے عرشی فہمی کے لیے اہل زبان و ادب کا شکریہ ادا کیا۔ جلسے کی نظامت معین شاداب نے کی۔ سیمینار کے تمام شرکا نے اس موقعے پر اتفاق رائے سے حکومت ہند سے مولانا عرشی کے نام پر ڈاک ٹکٹ جاری کرنے اور انھیں بھارت رتن سے نوازنے کا مطالبہ کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

نثار احمد فاروقی کی ادبی خدمات پر سیمینار

● نئی دہلی، 23 فروری۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی کی حیات اور ادبی خدمات پر ایک روزہ کل ہند سیمینار شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی اور دہلی اردو اکادمی کے اشتراک سے منعقد کیا گیا جس کی صدارت خواجہ حسن ثانی نظامی اور نظامت شعبۂ عربی کے استاد ڈاکٹر ولی اختر ندوی نے کی۔ مہمانانِ خصوصی پروفیسر امیر حسن عابدی اور پروفیسر محمد سلیمان اشرف تھے۔ جلسے میں اردو اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی کے علاوہ ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر عبدالودود اظہر، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر ایس بی ایف حسینی صدر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی اور ڈاکٹر چندر شیکھر نے بھی شرکت کی۔ صدر شعبۂ عربی پروفیسر محمد نعمان خاں نے اپنے تمہیدی کلمات میں پروفیسر نثار احمد فاروقی کی علمی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ تحقیق وتنقید کے میدان میں ان کا خاص مقام تھا۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر نثار احمد فاروقی سے اپنے ذاتی تعلقات کا ذکر کیا۔ پروفیسر سلیمان اشرف نے کہا کہ اردو اور فارسی ادب کو پروفیسر نثار احمد فاروقی سے بڑا فیض پہنچا۔ متین امروہوی نے فاروقی صاحب کو منظوم خراج عقیدت پیش کی۔

مقالہ خوانی کا پہلا اجلاس پروفیسر صادق کی صدارت اور ڈاکٹر علیم اشرف کی نظامت میں شروع ہوا جس میں پروفیسر محسن عثمانی ندوی، پروفیسر عبدالودود اظہر، پروفیسر شفیع شیخ، پروفیسر اسلم اصلاحی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، ڈاکٹر عائشہ کمال نے پروفیسر نثار احمد فاروقی کی حیات اور ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر بدرالدین الحافظ اور نظامت ڈاکٹر ابن کنول نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر محمد ایوب ندوی، ڈاکٹر حسنین اختر، پروفیسر شفیق احمد ندوی، پروفیسر محمد حسان خاں، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، ڈاکٹر عبدالقدوس، ڈاکٹر فوزان احمد نے بھی پروفیسر نثار احمد فاروقی کی ادبی خدمات پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ دوسرے اجلاس کے تقریباً تمام مقالات عربی میں پڑھے گئے۔ (عالمی سہارا، نئی دہلی)

مذاکرہ ''راجستھان میں اردو تحقیق: سمت و رفتار''

● جے پور، 8 جنوری۔ انجمن اساتذۂ جامعات ہند کی صوبائی شاخ اور راجستھان یونیورسٹی، جے پور کے شعبۂ اردو و فارسی کے زیر اہتمام قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے ''راجستھان میں اردو تحقیق: سمت و رفتار'' کے موضوع پر ایک روزہ سیمینار منعقد ہوا۔ اس میں پروفیسر حنیف نقوی نے ''ادبی تحقیق کے مسائل'' پر کلیدی خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر عبدالحق اس سیمینار میں مہمانِ خصوصی تھے۔ صدارت پروفیسر فیروز احمد (صدر انجمن اساتذہ جامعات ہند) نے کی۔

سیمینار کے دوسرے سیشن میں ڈاکٹر ثروت خاں نے ''اردو کے منظوم ڈرامے اور گلدستۂ پرستان''، ڈاکٹر فرخندہ ضمیر نے ''راجستھان میں اردو تحقیق: سمت و رفتار''، ڈاکٹر قمر جہاں نے ''ہاڑوتی کا ایک اہم محقق: مفتوں کوٹوی''، محمد شاہد پٹھان نے ''اودے پور میں اردو تحقیق'' ڈاکٹر مدبر علی زیدی نے'' پروفیسر محمود

شیرانی کا اسلوب تحقیق'' اور پروفیسر فیروز احمد نے ''گلزار نظیر مرتبہ سلیم جعفر۔ ایک مطالعہ'' کے عنوانات کے تحت مقالے پیش کیے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر روشن اختر کاظمی، ڈاکٹر ریاض الدین، ڈاکٹر ثریا خانم اور ڈاکٹر ارشد عبدالحمید نے راجستھان میں اردو تحقیق کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ آخر میں پروفیسر حنیف نقوی، پروفیسر عبدالحق اور پروفیسر فیروز احمد نے سیمینار میں پڑھے گئے مقالات پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر مدبر علی زیدی (صدر شعبۂ اردو) نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔
(ڈاک سے)

غالب میموریل لیکچر

● نئی دہلی، 10 فروری۔ '' اردو کے لوک ادب کو ہم کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کرسکتے۔ ہر زبان کا لوک ادب حالات و ماحول سے پیدا ہوتا ہے۔ اردو لوز ندہ رکھنے کے لیے اردو لوک ادب کا مطالعہ بے حد ضروری ہوگیا ہے۔'' ممتاز ادیب و ناقد پروفیسر قمر رئیس نے شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے ٹیگور ہال، دہلی یونیورسٹی میں غالب میموریل لیکچر پیش کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر قمر رئیس کے مقالے کا عنوان '' اردو میں لوک ادب: صورت حال اور چند سوالات'' تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں شہری ادب کے بنائے ہوئے پیمانے پر لوک ادب کو نہیں پرکھنا چاہیے۔

پروگرام کی صدارت ہندی کے ممتاز ادیب و ناقد پروفیسر نامور سنگھ نے کی۔ انھوں نے کہا کہ کم لوگ ہیں جو اردو پر بات کرتے وقت اردو کے لوک ادب پر گفتگو کرتے ہیں۔ پروفیسر صادق نے اردو لوک ادب کی تاریخ اور روایت پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر ابن کنول نے اردو کو عوام کی زبان بتایا اور عوامی ادب کو اردو کا بیش قیمت سرمایہ قرار دیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر علی جاوید نے بھی اظہار خیال کیا۔ جلسے میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر سلیمان اشرف، پروفیسر نعمان خاں، شاہد ماہلی سمیت دہلی یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے اساتذہ و طلبہ نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

اسماعیل میرٹھی یادگاری خطبہ

● میرٹھ، 23 فروری۔ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے شعبۂ اردو میں قومی اردو کونسل کے اشتراک سے پہلے اسماعیل میرٹھی خطبے کا انعقاد عمل میں آیا۔ خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ اسماعیل میرٹھی نہ صرف بچوں کے شاعر تھے بلکہ انھوں نے صالح معاشرے کی تشکیل میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ ڈاکٹر حنفی نے کہا کہ اردو ہماری تہذیب و کلچر کی محافظ اور مشترکہ تہذیب و تمدن کی عکاس ہے۔ انھوں نے اس موقعے پر شعبۂ اردو کے زیر اہتمام شائع ہونے والی شعبے کی طالبہ شاداب علم کی پہلی کتاب ''نظم جدید کی تثلیث'' کا اجرا بھی کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر مشتاق صدف نے کہا کہ اس کتاب میں میرٹھ کی تین اہم شخصیات قلق میرٹھی، رنج میرٹھی اور اسماعیل میرٹھی کی خدمات کا جامع طور سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر مختار رشی (اعلا تعلیم آفیسر)، میرٹھ کے سینئر وکیل عاصم علی سبزواری، پدم شری حکیم سیف الدین اور دیگر اہم شخصیات نے بھی جلسے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر جے کے پنڈیر نے اپنے صدارتی خطبے میں اسماعیل میرٹھی کی خدمات کو سراہا۔ ڈاکٹر کہکشاں لطیف نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے جبکہ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کلمات تعارف پیش کیے۔ (عالمی سہارا، نئی دہلی)

'' داغ: زبان اور فن'' سیمینار

● جودھپور: '' داغ نے نہ صرف اردو زبان کی خدمت کی بلکہ اسے عروج تک پہنچایا۔ بیان میں سادگی اور زبان کی شوخی کے سہارے انھوں نے قبول عام حاصل کی۔'' ان خیالات کا اظہار بزرگ شاعر ڈاکٹر فرید آفریدی نے بزم اردو، جودھپور کے زیر اہتمام مرزا داغ دہلوی کی 100 ویں برسی کے موقعے پر منعقد سیمینار '' داغ— زبان اور فن'' میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے کیا۔ مہمان خصوصی ہندی کے نقاد ڈاکٹر سورج پالی وال نے پریم چند اور جینندر کے حوالے سے داغ اور غالب کی انفرادیت پر روشنی ڈالی۔ راجستھان اردو اکادمی کے سابق وائس چیئر مین اور شاعر اے ڈی راہی نے داغ کے شاگردوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جودھپور سے بھی داغ کا گہرا رشتہ رہا ہے۔

بزم کے سکریٹری ڈاکٹر نثار راہی نے '' شعری روایت اور داغ کی غزل'' کے عنوان سے مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ '' داغ کا نشاطیہ لب و لہجہ مایوس زندگی کو مسکراہٹ عطا کرتا ہے۔ جلسے میں اشراق الاسلام ماہر، برجیش عنبر، اے زیڈ عابدی اور انیس الدین صدیقی نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس پروگرام کی نظامت مظاہر سلطان زئی نے کی اور محمد افضل جودھپوری نے شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

کیفی اعظمی پر مذاکرہ

● اعظم گڑھ، 2 مارچ۔ ممتاز ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی کی حیات و خدمات پر شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج میں منعقدہ دو روزہ سیمینار کی صدارت سجاشنی علی نے کی جب کہ نظامت شبلی کالج کے شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر شہاب الدین نے کی۔ کیفی اعظمی کی بیٹی فلمی اداکارہ شبانہ اعظمی نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ کیفی اعظمی غربا کے مسیحا تھے۔ انھوں نے کہا کہ کیفی اعظمی نے اردو ادب اور اردو شاعری کا چراغ جو یہاں سے روشن کیا وہ پورے ملک میں جل رہا ہے۔ کیفی محض کسی شخص یا شاعر کا نام نہیں ہے بلکہ ایک فکر اور فلسفے

کا نام ہے۔ ڈاکٹر شہاب الدین نے کہا کہ کیفی کی شاعری دلوں کے احساسات، فکر وفن اور خیالات کی نمائندگی کرتی ہے۔ سیمینار میں پروفیسر فضل امام رضوی، ایس ایس مہدی، آر کے سریواستو، کرن پرساد، پروفیسر علی احمد فاطمی اور پروفیسر عبدالحق نے خطاب کیا۔ جب کہ دوسرے اجلاس میں پروفیسر محمود الٰہی، پروفیسر افغان اللہ، پروفیسر علی جاوید، پروفیسر سہیل فاروقی، پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، پروفیسر عبدالرحمان ہاشمی، پروفیسر خورشید نعمانی، پروفیسر صاحب علی وغیرہ نے اپنے مقالے پیش کیے۔ افتتاحی اجلاس میں انیس احمد مبار کپوری نے کیفی اعظمی کی نظم اور علامہ شبلی نعمانی کی غزل پیش کی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اقلیتی تعلیمی کمیشن ایکٹ اور تعلیمی مسائل پر سمپوزیم

● نئی دہلی، 23 رفروری۔ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کی نو تشکیل شدہ کمیٹی کی دوسری میٹنگ زیر صدارت مولانا محمد ولی رحمانی نائب صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ میں متحدہ ترقی پسند محاذ حکومت کے کم از کم مشترکہ پروگرام میں اقلیتوں سے متعلق کیے گئے وعدوں کے نفاذ و عدم نفاذ کی صورت حال کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ ارکان نے قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات (ایکٹ) کا جائزہ لیا اور حکومت کے اس اقدام کی تحسین کی کہ اس نے اقلیتی تعلیمی مسائل کے حل پر مثبت قدم اٹھایا ہے۔ حاضرین نے یہ بھی محسوس کیا کہ چونکہ یہ ایکٹ بہت کم وقت میں تیار کیا گیا ہے اس لیے اس میں بعض بنیادی خامیاں رہ گئی ہیں۔ مثلاً ہائی اسکول کی سطح تک کی تعلیم کے سلسلے میں اس ایکٹ سے کوئی رہنمائی نہیں ملتی ہے۔ اس کمیشن کو صرف چھ یونیورسٹیز کے فیصلوں پر نظر ثانی اور فیصلہ دینے کا حق ہے مگر دوسری یونیورسٹیز اقلیتی تعلیمی اداروں کے ساتھ ناانصافی کریں تو یہ کمیشن اس سلسلے میں کوئی اقدام نہیں کرسکتا ہے۔ ایکٹ میں کمیشن کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً حکومت سے ہدایات حاصل کرتا رہے۔ ساتھ ہی اس کمیشن کی زندگی مرکزی حکومت کے رحم و کرم پر قائم رہے گی۔ اقلیتی تعلیمی اداروں کے مسائل بڑی حد تک ریاستی حکومت سے متعلق ہیں۔ اقلیتی تعلیمی کمیشن کسی ریاستی حکومت کو ہدایت دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اس ایکٹ پر غور وخوض اور تفصیلی رپورٹ تیار کرنے کے لیے جلد ہی ایک میٹنگ بلائی جائے گی۔ (ڈاک سے)

مذاکرہ ''معاصر ادب اور زمینی حقیقتیں''

● اودے پور، 24 رفروری۔ موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے ''معاصر اردو ادب اور زمینی حقیقتیں'' کے عنوان سے دوروزہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کا افتتاح شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کے خطبے سے ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اُردو ادب نے ہمیشہ سے ہی زمینی حقیقتوں کی عکاسی کی ہے۔ داستان ہو یا ناول، افسانہ ہو یا نظم زیادہ تر اصناف ادب میں ہمارے ادیبوں نے اپنے عہد اور اپنے زمانے کی سچائیوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ افتتاحی تقریب کے مہمان خصوصی جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر محمد شفیع آگوانی تھے۔ سیمینار سے خطاب کرنے والوں میں سکھاڑیا یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر کے کے سود، ڈین فیکلٹی پروفیسر ارون چترویدی بھی شامل تھے۔ اس سیمینار میں چار اجلاس منعقد ہوئے جن میں کئی اہم لوگوں نے مقالے پیش کیے۔ ان میں پروفیسر شاہد حسین، ڈاکٹر غلام حسین، ڈاکٹر آشوتوش موہن، ڈاکٹر شاہد پٹھان، ڈاکٹر شکیلہ رضوی، ڈاکٹر کلثوم بانو سیفی سرونجی، ڈاکٹر احتشام اختر، ڈاکٹر فرغانہ، ڈاکٹر حسینی بوہرہ اور مختار صدیقی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ اختتامیہ تقریب میں پروفیسر شاہد حسین نے تمام مقالوں پر گفتگو کرتے ہوئے سیمینار کے موضوع پر روشنی ڈالی۔ آخر میں ڈاکٹر زینب بانو انچارج شعبۂ اردو، موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

مذاکرہ ''دیارِ غیر میں اردو''

● جبل پور۔ انجمن ترقی اردو لائبریری جبل پور کی طرف سے ''دیارِ غیر میں اردو'' کے زیر عنوان ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس کی صدارت مولانا محمد امین نے کی اور ڈاکٹر اشفاق عارف نے نظامت کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اشفاق عارف، ڈاکٹر محمود شیخ اور سردار مشتاق سنگھ نے اپنے مقالوں میں یورپی ممالک میں اردو کی صورت حال پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر آفاق احمد نے امریکہ، کناڈا اور دیگر ممالک سے شائع ہونے والے اردو اخبارات و رسائل کا جائزہ پیش کیا۔ اس موقعے پر ایک مشاعرے کا انعقاد بھی عمل میں آیا جس میں طارق نظامی، صغیر ریاض، آفتاب احمد، غیاث آغازی، ماسٹر حنان تبسم اور پروفیسر آفاق احمد نے اپنا کلام پیش کیا۔ (ڈاک سے)

پریم چند پر سیمینار اور نمائش

● نئی دہلی، 10 رفروری۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منشی پریم چند پر منعقدہ سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے مرکزی وزیر خارجہ نٹور سنگھ نے کہا کہ اردو ہندی کے معروف افسانہ نگار منشی پریم چند کی جائے پیدائش لمہی (وارانسی) میں ان کا میموریل بنایا جائے گا۔ اس پروگرام کا انعقاد سینٹر فار جواہر لال نہرو اسٹڈیز (جامعہ) اور صفدر ہاشمی میموریل ٹرسٹ نے مشترکہ طور پر کیا تھا۔ مسٹر سنگھ نے اس موقعے پر منشی پریم چند کی ادبی تخلیقات سے متعلق ایک نمائش کا بھی افتتاح کیا۔ سینئر ادیب اشوک واجپئی نے کہا کہ دو زبانوں میں ایک ہی دور میں ممتاز تحریریں پیش کرنے والے پریم چند عظیم اور لافانی ہندستانی ادیب تھے۔ وہ اپنے وقت میں جتنے اہم تھے آج بھی اتنے ہی اہم ہیں۔ انھوں نے پریم چند کے ادب میں پیش کردہ مہاجنی تہذیب کو موجودہ بازار سے جوڑتے ہوئے کہا کہ پریم چند نے اس پر تلخی سے اپنا قلم اٹھایا ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ پریم چند کے افکار آج نئے

معانی رکھتے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن نے پریم چند کی تحریروں کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور پریم چند میموریل اور سینٹر کے قیام کے مقاصد بیان کیے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

سلام بن رزّاق پر سمپوزیم

● پونے، 5 فروری۔ نامور افسانہ نگار سلام بن رزّاق کو ان کے افسانوی مجموعے ''شکستہ بتوں کے درمیاں'' پر ساہتیہ اکادمی انعام دیے جانے پر دکن مسلم ایجوکیشن اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ کی جانب سے ان کے فن اور شخصیت پر ایک سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت جناب منور پیر بھائی نے کی۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے سلام بن رزّاق کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے سیمینار کا افتتاح کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر رام پنڈت نے اپنا مضمون ''کتھایوگی کی کتھا یاترا'' پروفیسر معین الدین جینابڑے نے ''سلام بن رزّاق کا فن'' ڈاکٹر غیاث الدین نے ''سلام بن رزّاق کی افسانہ نگاری'' اور وقار قادری نے ''بھائی کو سلام'' کے عنوان سے ان کی شخصیت پر ایک خاکہ پیش کیا۔ اس موقعے پر سلام بن رزّاق نے اپنے افسانوں پر مختلف سوالات کے جواب دیے۔ محترمہ ظہورہ سید کے شکریے پر پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ (ڈاک سے)

اردو ادب کی تاریخ پر ورک شاپ

● سولن، 28 فروری۔ اردو ادب کی تاریخ پر اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر (حکومت ہند)، سولن کی جانب سے پانچ روزہ ورکشاپ منعقد کیا گیا۔ افتتاحی تقریب میں ورکشاپ کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے بتایا کہ اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر میں اردو سے ناواقف اساتذہ کو اردو تدریس کی تربیت دی جاتی ہے۔ پہلے انھیں اردو سکھائی جاتی ہے، پھر پڑھانے کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مرکز اردو ادب کی تاریخ پر ایک ایسی کتاب تیار کر رہا ہے جو آسان اور معروضی انداز میں ہوتا کہ اردو داں اساتذہ اور ادب کی تاریخ سے واقف ہوسکیں۔ ڈاکٹر سید خطیب مصطفیٰ نے کہا کہ لسانی نقطۂ نظر سے اردو ہندی سے بہت مطابقت ہے اس لیے ہندی جاننے والے بہت جلد اردو سیکھ لیتے ہیں لیکن ان کی استعداد ایسی نہیں ہوتی کہ وہ مشکل زبان میں کوئی تحریر پڑھ سکیں۔ انھیں اردو ادب کی تاریخ سے واقف کرانے کے لیے ایسا درسی مواد تیار کرنا ضروری ہے جس سے زیر تربیت اساتذہ آسان زبان میں اردو ادب کی پوری تاریخ سے واقف ہوجائیں۔ اس ورکشاپ میں دلّی سے ڈاکٹر عقیل احمد، ڈاکٹر جلال انجم، ڈاکٹر نگار عظیم، ڈاکٹر طاہر حسین اور شاہد ماہلی، مالیرکوٹلہ سے ڈاکٹر روبینہ شبنم، ڈاکٹر خالد کفایت، الہ آباد سے کہکشاں عرفان، سولن سے ڈاکٹر جوگ راج یوگ اور زبیر شاداب نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

ریسرچ اسکالر سیمینار

● نئی دہلی، 24 فروری۔ اردو ریسرچ اسکالر ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اٹھارھویں صدی کے شعری رجحانات پر سیمینار کا انعقاد ہوا۔ اراکین مجلس صدارت میں پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، ڈاکٹر ابن کنول، پروفیسر صابرین، ڈاکٹر احمد محفوظ اور خالد جاوید شامل تھے۔ اس موقعے پر عمیر منظر، روما نہ نازلی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) سعید احمد، مومنہ خاتون (جے این یو) اور محمد عاصم اکرم (دہلی یونیورسٹی) نے مقالے پیش کیے۔ مقالہ خوانی کے بعد ریسرچ اسکالرز اور طلبہ نے پڑھے گئے مقالوں کے حوالے سے سوالات کیے۔ جاوید رحمانی، عبدالرب، محمد ہادی رہبر اور دیگر اسکالرز نے بحث کو آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر ابن کنول نے کہا کہ اٹھارھویں صدی سلطنت کے لیے اگرچہ زوال کی صدی تھی مگر اردو ادب کے لیے یہ عروج کا زمانہ تھا۔ خالد جاوید نے مقالوں پر گفتگو کرتے ہوئے آزادانہ غوروفکر کے شعور کے فروغ پر زور دیا۔ ڈاکٹر احمد محفوظ نے تمام مقالوں پر گفتگو کی اور کہا کہ مضمون آفرینی اور معنی آفرینی پیدا کرنے کا سب سے اہم اور موثر وسیلہ ایہام ہے۔ صدر شعبہ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے اردو کی عمومی صورت حال اور اردو تحقیق کی سمت و رفتار پر روشنی ڈالی۔ سیمینار کی نظامت عمیر منظر نے کی۔ محمد ہادی رہبر کے اظہار تشکر پر سیمینار کا اختتام ہوا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

2004 کی بہترین کتابوں پر اردو اکادمی دہلی کے انعامات

● نئی دہلی، 23 فروری۔ اردو اکادمی کی ایوارڈ ڈکلچرل سب کمیٹی کی سفارش پر 2004 کی بہترین کتابوں پر انعامات دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ان انعامات میں 5100 روپے فی کس کے 9 انعامات اور 11 انعامات 3500 روپے فی کس کی رقم کے ہیں۔ اکادمی کے وائس چیرمین م. افضل کی صدارت میں منعقد میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا۔

5100 روپے کے لیے منتخب کتابیں: رتن ناتھ سرشار (پریم پال اشک)، وضاحتی کتابیات (پروفیسر مظفر حنفی)، سردار جعفری کی نادر تحریر (ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی)، غالب اور فنون لطیفہ (زبیر رضوی)، دہلی کے مدارس و مکاتب (محمد اختر صدیقی)، بڑا بے ادب ہوں (منظور عثمانی)، طبی صحائف (حکیم اشہر قدیر)، ادو یہ معدنیہ (ڈاکٹر مستحسن عباس علی)، ابابیلیں نہیں آئیں (حنیف ترین)۔

3500 روپے کے لیے منتخب کتابیں: شاگردانِ داغ کی ادبی خدمات (اصغر کمال)، مولانا افتخار فریدی کی حیات و خدمات (معصوم مرادآبادی)، اردو رپورتاژ (طلعت گل)، افکار و نظریات (ظل ہما)، بلاد ہند کی داستان (وسیم احمد

سعید)، پھمر زل (ترنم ریاض)، ستارہ سنگ (عادل حیات)، آسمان در آسمان (جگدیش پرکاش)، کشف الالفاظ: غزلیات غالب (ج.ع.واحد)، سائنس آپ کے لیے (حافظ عبدالرحمان)، تعلیمی نفسیات کیا ہے (عصمت جہاں صدیقی)، اس کے علاوہ ناشرین سے موصول کتابوں کی بنیاد پر منشی نول کشور انعام برائے بہترین ناشر کے لیے شاہد پبلی کیشن اور عاکف بک ڈپو دونوں کو فی کس 5100 روپے کے نقد انعامات دیے جانے کا اعلان کیا گیا ہے۔ (ڈاک سے)

بہار اردو اکادمی کے انعامات

● پٹنہ، 14 رفروری۔ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد سکریٹری بہار اردو اکادمی، پٹنہ کی اطلاع کے مطابق اکادمی میں گزشتہ کئی برسوں سے انعام کے لیے موصولہ کتابوں پر مجلس عاملہ کے فیصلے کے مطابق درج ذیل انعامات دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے:

تین ہزار روپے کا انعام: بادصبا کا انتظار۔ سید محمد اشرف، پالکی کہکشاں کی۔ مظہر امام۔ دو یہ بانی۔ غضنفر، زہرگل۔ عالم خورشید، شاخ زیتون۔ رمز عظیم آبادی، جینے والے۔ عابد سہیل، انکاس۔ ظفر حمیدی (محمد سعد اللہ)۔

دو ہزار روپے کا انعام: شہر غزل رفعت سروش، ہوئے ہم دوست جس کے۔ مجتبیٰ حسین، کلیم الدین احمد کی تنقید کا ایک تنقیدی جائزہ۔ ڈاکٹر ابرار رحمانی، رسالہ معاصر: ایک ادبی منظر نامہ۔ ڈاکٹر اکبر علی، اردو کی منتخب تاریخوں کا تنقیدی جائزہ۔ ڈاکٹر غلام رسول ساجد، دوسری مخلوق۔ محمود ایوبی، اقبال کی جمالیات۔ ڈاکٹر قدوس جاوید، تیشۂ صدا۔ م.ق. خان، آہنگ۔ رفیعہ منظور الامین، ارتعاش قلم۔ قیوم خضر، اقبال۔ عصری تناظر۔ ڈاکٹر منظر اعجاز، اردو میں ہند دھرم۔ اجے مالویہ، مولانا ابوالکلام آزاد۔ ضیاء الدین اصلاحی۔

15 سو روپے کا انعام: تلاش۔ مشتاق انجم، بے در و دیوار۔ سید احمد شمیم، شعلوں کے پھول۔ معصوم شرقی اسیر، ولت کتھا۔ وقار قادری، لفظوں کا آکاش۔ کرامت علی کرامت، نفسی تجربے اور ادبی تخلیق۔ ارشد مسعود ہاشمی، ایک عرض تمنا۔ ظہیر انور، علقمہ شبلی حیات اور شاعری۔ ڈاکٹر مظہر کبریا، من خوب می شناسم۔ بازغ بہاری، حرف دلنواز۔ کمال جعفری، ورنہ۔ یوسف ناظم، نئے دیس میں۔ جتیندر بلو۔

ایک ہزار روپے کا انعام: بہار میں اردو ڈرامہ آزادی کے بعد۔ محمد منصور انصاری، اداس جنگل میں۔ رونق نعیم، راسخ شخصیت اور فن۔ ڈاکٹر محمد ممتاز عالم، قاضی عبدالودود کی علمی و ادبی خدمات۔ ڈاکٹر محمد نور الاسلام، تنقید کی زبان۔ پروفیسر کمال الدین، کتاب کا نکاح ثانی۔ منظور عثمانی، اندھیرے کے مسافر۔ فرحت قادری، حصار ورد۔ حسن امام درد، میری کہانی۔ اویس احمد دوراں، افق کی مسکراہٹ۔ اسلم جمشید پوری، لمحوں کی صدا۔ ناز قادری، مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ۔ ڈاکٹر امام اعظم، جنگل میں منگل۔ بانو سرتاج، مثنوی جہاں شاہ و جہاں بانو۔ ڈاکٹر یوسف تقی، آئینۂ عرفاں۔ صابر آروی، عطر گل۔ ناصر زیدی، وسیلہ۔ مختار احمد عاصی، مخزن فوائد۔ ڈاکٹر محمد ذاکر حسین، سید صباح الدین رحمٰن: حیات وخدمات۔ ڈاکٹر شہریار احمد۔ (ڈاک سے)

سائنس اور کائنات سوسائٹی کا سائنسی میلہ

● نئی دہلی، 2 رفروری۔ عالمی سال طبیعیات 2005 کے موقعے پر سائنس اور کائنات سوسائٹی کی جانب سے ایک روزہ سائنسی میلے کا انعقاد کیا گیا جس میں مختلف مقابلہ جاتی پروگرام ہوئے۔ مقابلوں میں علی گڑھ ضلع کے مختلف اسکولوں سے ڈیڑھ سو طلبہ و طالبات نے حصہ لیا۔ یہ مقابلہ سائنسی نمائش، مضمون نگاری، کوئز، پینٹنگ، غزل، تقریری مقابلہ، فلاورشو، فینسی ڈریس پر مشتمل تھا۔

پروگرام کا افتتاح پروفیسر سید اقبال علی پرنسپل یونیورسٹی پالیٹکنک نے کیا۔ ان مقابلوں میں جج کے فرائض جناب ارشد غازی بانی اکادمی آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز، ڈاکٹر رئیس احمد مسلم ایسوسی ایشن فار ایڈوانس منٹ آف سائنس (MAAS)، محترمہ غوثیہ دانش اور ڈاکٹر الیاس نوید گنوری نے انجام دیے۔

پروگرام کی آخری نشست میں مہمان خصوصی کے طور پر جناب وجیندر سنگھ ممبر آف پارلیمنٹ علی گڑھ کے علاوہ مہمان اعزازی کے طور پر (میئر علی گڑھ) محترمہ ساوتری دیوی، جناب ارشد غازی، ڈاکٹر ذکی کرمانی، جناب فرقان احمد نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● نئی دہلی، 24 رفروری۔ جمعیت لا انسٹی ٹیوٹ کے بانی صدر، معروف قانون داں اور قومی کے سابق چیئرمین، پروفیسر طاہر محمود کی خودنوشت سوانح حیات انگریزی زبان میں بہ عنوان "Amid Gods and Lords: My Life with Votaries of Religion and Law" شائع ہوئی ہے۔ ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کے مختلف ابواب میں متعدد اہم شخصیات و واقعات کے معلوماتی تذکروں کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، انڈین لا انسٹی ٹیوٹ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد، انسٹی ٹیوٹ آف اسٹڈیز، قومی اردو کونسل، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، قومی اور انسانی حقوق کمیشن کے علاوہ اور بھی کئی اداروں اور ان کے ذمے داران سے متعلق دلچسپ باتیں بیان کی گئی ہیں۔ کتاب میں جگہ جگہ اردو اشعار اور ان کے انگریزی جملے بھی دیے گئے ہیں۔ کتاب میں متعدد تصاویر شامل ہیں اور ایک طویل اشاریہ بھی۔ یہ کتاب ایمیٹی یونیورسٹی پریس سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ (ڈاک سے)

● پونے، 22رفروری۔ اعظم کیمپس پونے کے اسمبلی ہال میں متوّر پیر بھائی (چیئرمین حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، پونے) کی صدارت میں سہ ماہی ''اسباق'' پونے کے ڈاکٹر محبوب راہی نمبر کی تقریب رونمائی کا انعقاد عمل میں آیا۔ بزرگ شاعر امین حزیں نے استقبالیہ تقریر میں تمام شرکا کا استقبال کرتے ہوئے محبوب راہی کے تخلیقی کارناموں پر روشنی ڈالی۔ معروف شاعر و ادیب جناب عبدالاحد ساز نے اس خصوصی نمبر کا اجرا کیا۔ اس موقعے پر محبوب راہی صاحب کو متور پیر بھائی کے ہاتھوں اسباق ادبی ایوارڈ برائے 2004 دیا گیا۔ جلسے میں عبدالاحد ساز، مشہور افسانہ نگار قاضی مشتاق اور رفیق جعفر نے بھی اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر محبوب راہی نے اس موقعے پر تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ جلسے کی نظامت شمیم رحمانی نے کی۔ (ڈاک سے)

● ممبئی، 13رفروری۔ شاکر سوپاروی میموریل ٹرسٹ کی طرف سے پانچویں سرسید احمد ادبی انعامات کی تقسیم کا جلسہ منعقد ہوا۔ اس موقعے پر صدر جلسہ جناب علی ایم شمسی کے دستِ مبارک سے افسانہ نگار مظہر سلیم، شاعر شجاع الدین شاہد اور صحافی فرحان حنیف کو سرسید ایوارڈ سے نوازا گیا۔ جلسے میں تعلیمی میدان میں فعال افراد کو بھی انعام سے نوازا گیا۔ اس تقریب کی نظامت کے فرائض جناب معین الدین شیخ نے انجام دیے۔ اس جلسے میں مشہور شاعر قیصر الجعفری، ماہر الحسن، ساحل احمد اور سعید خاں نے بھی شرکت کی۔ (ڈاک سے)

● 25ردسمبر۔ ودربھ ویلفیئر ایسوسی ایشن، ممبئی کی جانب سے ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا گرلز اسکول میں مشہور ادیبہ محترمہ نورالعین علی کی ادبی خدمات پر ایک تہنیتی جلسہ منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر شجاع الدین شاہد کی نظموں کے مجموعے ''گلشن گلشن پھول کھلے'' کی رسمِ اجرا ڈاکٹر صادق پٹیل کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ ایسوسی ایشن کے بانی قاسم رضا اور پروفیسر مظہر سلیم نے نورالعین علی اور شجاع الدین شاہد کے فکروفن پر روشنی ڈالی۔ اس تقریب میں ایس۔ایچ۔ عابدی، نذر حسین، سمیع خطیب، طاہر علی، ڈاکٹر اے۔آر۔ خاں، شیخ محمود، محمد افضل اور سید محبوب وغیرہ اہم شخصیات نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

● بلند شہر، یکم جنوری۔ ممتاز شاعر اور ''انوارِ حرم'' کے مصنف جناب شاداں سلطان پوری کے اعزاز میں جناب عقیل احمد آفریدی کے دولت خانے پر ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت جناب رشید انجم بخی نے اور نظامت ڈاکٹر محمد اسلم نے کی۔ مشاعرے میں ماجد انصاری، مومن بلند شہری، تہور بلند شہری، رہبر بلند شہری، مشتاق کمال پوری ڈاکٹر حسین اعظم، ڈاکٹر محمد اسلم، شاداں سلطان پوری وغیرہ نے کلام پیش کیا۔ (ڈاک سے)

● حاجی پور۔ بزرگ شاعر ثوبان فاروقی کے اعزاز میں انجمن ترقی اردو، ویشالی کی طرف سے ایک جلسہ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صدر انجمن ترقی اردو، ویشالی کی صدارت میں 13رفروری کو ساجدہ منزل، باغ ملی، حاجی پور میں منعقد ہوا۔ اس موقعے پر جناب فاروقی کے شعری مجموعے ''سراب ساسر آبجو'' کی اشاعت پر انھیں تہنیت پیش کی گئی۔ جلسے میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، مولانا آفتاب عالم، مولانا امین احمد خاں چترویدی، انورالحسن وسطوی، ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق اور سید مصباح الدین احمد نے ثوبان فاروقی کی شخصیت اور شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر ثوبان فاروقی نے بھی اس موقعے پر اپنے تاثرات پیش کیے۔ (ڈاک سے)

● ناگپور۔ ڈاکٹر محمد یٰسین قدوسی، ناظم عربی و فارسی کتبات، حکومت ہند، ناگپور کی تصنیف ''تاجدارِ ناگپور'' جو تاج الاولیا بابا تاج الدینؒ ناگپوری پر لکھی گئی ہے، کا اجرا ایک ساتھ کامٹی اور واڑی ضلع ناگپور میں عمل میں آیا۔ واڑی میں جناب گیانیشور ڈھاکے اور جناب پربھاکر ڈھاکے ٹرسٹ واڑی نے اس کا اجرا کیا جبکہ کامٹی میں جناب بدیع الزماں یزدانی نے اس کی رسمِ اجرا انجام دی۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں سامعین نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

رسمِ اجرا

افکارِ ذاکر

● نئی دہلی، 9رفروری۔ ''ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے جس نظریۂ تعلیم کی بنیاد پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کو پروان چڑھایا تھا، موجودہ زمانے میں تعلیم کو انسانی اور تہذیبی اقدار سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اسے پھر سے فروغ دینے کی ضرورت ہے۔'' ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیرالحسن نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی تحریروں پر مشتمل کتاب ''افکار ذاکر'' کا اجرا کرتے ہوئے کیا۔ یہ کتاب ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خصوصی پیش کش ہے جسے مکتبہ جامعہ نے شائع کیا ہے۔

قبل ازیں ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر پروفیسر اختر الواسع نے اس کتاب کے حوالے سے اس تقریب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ذاکر صاحب کے لیے آدمی گری کی ایک ایسی تجربہ گاہ تھی جہاں طلبہ کے ذہن و شعور کو علوم کے حصول اور فروغ کا اہل بنانے، انھیں ان تمام ذہنی مہارتوں سے لیس کرنے جو دنیا اور زندگی کی تعمیر و ترقی کے لیے ضروری ہیں، کے ساتھ ہی ساتھ ان کے باطن کو بھی روشن کرنے کی کامیاب کوششیں کی گئیں تاکہ اس آئینے میں وہ تمام انسانی و تہذیبی اقدار منعکس ہوسکیں جن کے بغیر کسی انسانی دنیا کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ جامعہ کے سابق چانسلر جناب خورشید عالم خاں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ذاکر صاحب اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے

ہیں۔ اس تقریب میں پاکستان سے آئے ہوئے تین ممتاز مورخین ڈاکٹر شریف المجاہد، ڈاکٹر حسن عسکری رضی اور ڈاکٹر کے. کے. عزیز کے علاوہ جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ اور دیگر ممتاز دانش وروں اور صحافیوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ (اخبار مشرق، دہلی)

جدید عربی ادب

● نئی دہلی، 3رجنوری۔ یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا، نئی دہلی کی طرف سے حرا پبلک اسکول میں ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ عربی کے سابق صدر پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی ایکٹنگ پریسیڈنٹ یو ایم آئی نے کی۔ اس جلسے میں مصر کے معروف ادیب و دانشور ڈاکٹر شوقی ضیف کی کتاب ''الادب العربی المعاصر فی مصر'' کے اردو ترجمے موسوم بہ ''جدید عربی ادب'' کی رسم اجرا پروفیسر محمد نعمان خاں صدر شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ بعد ازاں کتاب کے مترجم ڈاکٹر شمس کمال انجم (شمس مدنی) نے کتاب اور صاحب کتاب کا مختصر تعارف کراتے ہوئے کتاب کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ اس کتاب کا عربی ایڈیشن 1957 میں مصر میں منظر عام پر آیا اور اب تک اس کے ایک درجن سے زائد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں 1855 سے 1955 تک کی سو سالہ ادبی و شعری تاریخ کی خصوصیات و امتیازات کی تفصیل پیش کی گئی ہے اور مجددین و کلاسیکی ادبا کے ادبی معرکوں پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس تقریب میں پروفیسر الطاف اعظمی سابق صدر شعبۂ ہسٹری آف میڈیسن اینڈ سائنس جامعہ ہمدرد، پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر شریف احمد کے علاوہ متعدد ادبا شعرا اور دانشوران نے شرکت کی۔ نشست کی نظامت ڈاکٹر عبدالمعز استاد شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے انجام دی اور آخر میں یو ایم آئی کی طرف سے صحافی سہیل انجم نے شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

نیپال میں اردو

● پٹنہ۔ ممتاز نقاد پروفیسر عبدالمغنی نے ڈاکٹر نسیم اختر کی کتاب ''نیپال میں اردو'' کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ نیپال میں اردو کی صورت حال کا تحقیقی جائزہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ نیپال کی سرزمین پر اردو کا چلن، رواج، ترقی ان سب چیزوں کی تحقیق ایک اہم کام ہے اور اس کتاب کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کتاب کے مصنف صحیح معنوں میں تحقیق کے اہل ہیں۔ اس موقعے پر پدم شری جناب کلیم عاجز نے کہا کہ یہ کتاب ڈاکٹر نسیم اختر کی لسانی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ ''پنجاب میں اردو''، ''مدراس میں اردو''، ''دکن میں اردو'' کے بعد اب ''نیپال میں اردو'' نے ثابت کر دیا ہے کہ اردو محبت کی زبان ہے اور اس کا ارتقائی سفر جاری ہے۔ اس موقعے پر پٹنہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور معروف ماہر تعلیم پروفیسر نظر احسن نے بھی اظہار خیال کیا۔ ''سلسلہ'' پٹنہ کے زیر اہتمام 25 دسمبر 2004 کو منعقدہ اس تقریب میں جن لوگوں نے ''نیپال میں اردو'' پر اپنے مقالات پیش کیے ان میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر کلیم الرحمٰن، جناب واحد نظیر، جناب اعجاز بن ضیا او گانوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ (ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

مشفق خواجہ

● نئی دہلی، 22رفروری۔ اردو کے ممتاز محقق، نقاد، کالم نویس اور مزاح نگار جناب مشفق خواجہ کا 21-22رفروری کی درمیانی شب میں انتقال ہو گیا۔ خواجہ صاحب دل کے مریض تھے اور پچھلے سال ان کے دل کا آپریشن ہوا تھا۔ وہ بالکل صحت یاب ہو گئے تھے۔ کچھ ہی دن بعد انھیں گردے کی تکلیف شروع ہوئی اور یہ تکلیف اتنی بڑھی کہ آخری وقت میں ان کے گردے صرف 25 فیصد کام کر رہے تھے۔ تین چار دن پہلے ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ وہ اسپتال میں داخل کیے گئے جہاں ان کا انتقال ہو گیا۔ مشفق خواجہ کی پیدائش 19 دسمبر 1935 کو لاہور میں ہوئی۔ انھوں نے لاہور میں ہی تعلیم حاصل کی۔ 1958 میں انھوں نے ایم اے کیا اور 1957 سے 1993 تک انجمن ترقی اردو (پاکستان) سے وابستہ رہے۔ ''پرانے شاعر، نیا کلام''، ''جائزہ مخطوطات اردو''، ''غالب اور صفیر بلگرامی'' اور شعری مجموعہ ''ادبیات'' ان کی اہم کتابیں ہیں۔ مشفق خواجہ صاحب کے انتقال کی خبر تمام اردو دنیا کے لیے انتہائی رنج و غم کا باعث ہے۔

محمد شمس الحق

● پٹنہ۔ ممتاز جغرافیہ داں، ماہر تعلیم اور ادیب جناب محمد شمس الحق کا 18رفروری 2005 کو پٹنہ میں دوپہر ڈیڑھ بجے برین ہیمرج کے سبب انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر 65 برس تھی۔ وہ اگست 1999 میں پٹنہ اینگلو عربک انٹر کالج سے بحیثیت استاد جغرافیہ ریٹائر ہوئے تھے۔ جناب شمس الحق کے والد محمد یونس مرحوم بھی ماہر جغرافیہ، ماہر تعلیم اور پٹنہ مسلم ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ چھ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ان کے ایک صاحبزادے زی نیوز سے وابستہ ہیں۔

جناب شمس الحق اردو درسی کتابوں کی تیاری میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کی خدمات بہار ٹکسٹ بک کارپوریشن کے علاوہ دیگر موقر اشاعتی اداروں نے بھی حاصل کیں۔ مرحوم ایک بے حد شفیق استاد تھے۔ اپنے موضوع پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ ان کی اہم درسی کتابوں میں طرز نگارش، ہماری دنیا (دو حصے)، نگارش آموز جدید (دو حصے)، معلومات عامہ (دو حصے)، جغرافیہ برائے مڈل اور سیکنڈری

درجات اور ہندی میں مان چتر کار (ورلڈ اور انڈیا) قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے مڈل اور سیکنڈری درجات کی جدید تاریخ، تاریخ ہند، مطالعہ سماج، علمِ تمدن اور جغرافیہ کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ان کی دو اہم کتابیں ''آؤ سمندروں کی سیر کریں'' اور ''ماحولیات'' شائع کی ہیں۔ ''آؤ پہاڑوں کی سیر کریں'' ابھی زیرِ طبع ہے۔

اردو ادب سے بھی انھیں گہری دلچسپی تھی۔ طلبہ کے لیے طرز نگارش ان کی مقبول ترین کتاب ہے۔ طلبہ کے لیے ان کی دیگر دو ادبی کتابیں ''انشائیہ اور انشائیے'' اور ''شریف زادہ تلخیص تجزیہ اور تبصرہ'' بھی شائع ہوچکی ہیں۔ ''رمز عظیم آبادی: شخصیت اور فن'' کے نام سے انھوں نے ایک کتاب ترتیب دی۔ وہ اردو زبان و ادب کے شیدائی تھے اور اس زبان کی حقیقی ترقی کے لیے مسلسل کوشاں رہتے تھے۔

جناب محمد شمس الحق اردو میں جغرافیہ پر ایک ایسی سیریز کی اشاعت کے خواہش مند تھے جو اردو طلبہ کے لیے کم از کم سینئر سیکنڈری درجات تک معاون ہو۔ انھوں نے اس کا ایک مکمل نقشہ بھی تیار کرلیا تھا۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب ''طبعی جغرافیہ'' (ضخامت 432 صفحات) قومی اردو کونسل کے جزوی مالی تعاون سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ جناب شمس الحق کی ایک دوسری تازہ کتاب ''تکنیکی اصطلاحات کی فرہنگ'' فرید بکڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ نے شائع کی ہے۔

(ڈاک سے)

حافظ عبدالرزاق حافظ

● بچوں کے مشہور و معروف شاعر جناب حافظ عبدالرزاق حافظ باقوی راپچوٹی کا 3 رفروری 2005 کو مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ موصوف ایک جید عالم اور باکمال شاعر تھے۔ انھوں نے بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر نہایت سلیس اور آسان بحروں میں نظمیں لکھیں۔ ان کی مندرجہ ذیل تخلیقات منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

1. نئی کلیاں، 2. ننھے پھول، 3. پھلواری، 4. چاند تارے، 5. ذکر حبیبؐ، 6. نور علیٰ نور، 7. بہارِ سخن، 8. سیرتِ طیبہ۔

ان کے علاوہ دو نثری تصانیف 1. ''تکبیرِ اعظم'' (نواب عبدالحکیم کی سوانح عمری) اور 2. ''وشارم میں اردو'' شائع ہوچکی ہیں۔ موصوف کی کئی نظمیں تمل ناڈو، آندھرا پردیش، کرناٹک اور مہاراشٹر کے درسی نصاب میں داخل ہیں۔

مرحوم اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول سِل وشارم اور سی عبدالحکیم کالج سِل وشارم میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر پچھتر سال تھی۔

ایس. اے. رحیم

● ناگ پور۔ ودربھ کے معروف اسکالر ڈاکٹر سید عبدالرحیم کا طویل علالت کے بعد 73 سال کی عمر میں 16 رفروری 2005 کو ناگپور میں انتقال ہوگیا۔ آپ عربی، فارسی اور اردو کے صاحب التصانیف عالم اور محقق تھے۔ ڈاکٹر ایس. اے. رحیم کی پیدائش اچل پور میں ہوئی۔ وہ پہلے محکمۂ آثارِ قدیمۂ ہند، ناگپور، میں کتبہ شناس کی حیثیت سے مصروف کار رہے پھر گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز (قدیم مارس کالج)، ناگ پور میں عربی کے پروفیسر رہے اور 1992 میں ڈائرکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ انھیں 1992 میں فارسی زبان کی خدمات کے لیے صدر جمہوریہ ہند نے ایوارڈ سے نوازا۔

□□□

اَسّی دن میں دنیا کا سفر

مصنف: جولس ورن / مترجم: صفدر حسین

ایک بے حد دلچسپ ناول جس میں ایک اصول پسند اور اولوالعزم آدمی کی کہانی بیان کی گئی ہے جس نے اپنے دوستوں کے ساتھ شرط لگائی تھی کہ وہ اَسّی دن میں پوری دنیا کا سفر طے کرے گا۔ 20 ہزار پونڈ کی اس شرط کو جیتنے کے لیے اس نے اس سے کئی گنا زیادہ رقم خرچ کردی۔ لیکن کیا وہ شرط جیت سکا؟ یہ جاننے کے لیے کتاب کا مطالعہ کریں۔

صفحات: 170، قیمت: -/21 روپے

حیوانات کی دلچسپ دنیا

مصنف: محمد خلیل

حیوانات ہماری رنگ برنگی دنیا کے حسن و دلفریبی میں اضافہ بھی کرتے ہیں اور ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں بھی معاون ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں بڑے دلچسپ انداز میں مختلف قسم کے حیوانات مثلاً ڈائنوسور، ہرن، بلی، ہائیڈرا، جگنو، شیر اور چیتا وغیرہ سے متعلق تفصیلات درج ہیں۔ ایک بے حد دلچسپ کتاب جس کو بچوں کے ساتھ بڑے بھی پسند کریں گے۔

صفحات: 111، قیمت: -/17 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تبصرہ وتعارف

تاریخ ٹیپو سلطان/محب الحسن

مترجمین: حامد اللہ افسر، عتیق صدیقی

صفحات: 556، قیمت: 120 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1 آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: ظفر احمد نظامی

تاریخ ٹیپو سلطان نامور تاریخ داں پروفیسر محب الحسن کی انگریزی تصنیف The History of Tipu Sultan کا اردو ترجمہ ہے۔ اگر چہ اس موضوع پر کئی کتابیں آچکی ہیں لیکن پروفیسر محب الحسن کی یہ تصنیف انتہائی مستند اور معتبر ہے۔ ٹیپو سلطان کی شخصیت کو انگریز مورخین نے ''ننگ انسانیت عفریت'' کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے اسے رسوا کرنے کی دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششیں کیں اور بہت سے ہندستانی مورخین نے ان کے بیانات کو آنکھ بند کر کے قبول کرلیا۔ پروفیسر حسن نے معروضی انداز میں مطالعہ کر کے اپنے نتائج اخذ کیے ہیں جو نہایت اہم ہیں اور واقعات پر نئی روشنی ڈالتے ہیں۔

انھوں نے اس کتاب کو بائیس ابواب میں تقسیم کرتے ہوئے اولین تین ابواب کو ٹیپو کے والد حیدر علی کے لیے وقف کیا ہے۔ ان ابواب میں ٹیپو کے اجداد، اس کی ابتدائی زندگی اور تخت نشینی کے ساتھ ہی ساتھ انگریزوں کے خلاف حیدر علی کی جنگوں کی تفصیلات درج ہیں۔ ٹیپو کے دور حکومت میں ہونے والی سازشوں اور بغاوتوں کا ذکر اور مرہٹوں اور نظام کے ساتھ اس کی جنگ کا بیان اگلے ابواب میں شامل ہے۔ کتاب میں قسطنطنیہ میں سفارت، کورگ اور مالا بار میں بغاوت، ٹراونکور کے حکمراں کے ساتھ جنگ اور ٹیپو کی جنگوں کی تفصیلات درج ہیں۔ جنگ کے آخری رخ کے بعد صلح نامۂ سرنگا پٹم کے نتائج اور ٹیپو سلطان کی شکست کے اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ بعد ازاں انگریزوں کے ساتھ آخری جنگ اور سقوط سرنگا پٹم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اپنی راجدھانی کو خطرے میں دیکھ کر ٹیپو نے انگریزوں سے صلح کرنے کی کوشش کی تھی۔ 9/اپریل 1799 کو اس نے انگریز جنرل سے ایک خط میں میسور پر حملے کے خلاف احتجاج کیا لیکن اس کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملا۔ لہٰذا 20/اپریل کو ایک اور خط میں اس نے انگریزوں کے ساتھ امن کے ساتھ رہنے کی خواہش کا اعادہ کرتے ہوئے صلح کے مذاکرات کے لیے اپنا وکیل بھیجنے کی تجویز پیش کی۔ 22/اپریل کو انگریز جنرل نے اس کا جواب دیتے ہوئے ابتدائی صلح نامہ کا ایک مسودہ منسلک کر دیا جسے سلطان کو قبول کرنا تھا۔ صلح نامے کی شرطوں کے مطابق ٹیپو کو اپنی نصف قلمرو سے دست بردار ہونا تھا اور دو کروڑ روپے بطور تاوان جنگ ادا کرنے تھے۔ ایک کروڑ روپے کی فوری طور پر اور بقیہ ایک کروڑ کی ادائیگی چھے مہینوں کی مدت میں کرنی تھی اور اپنے چار بیٹوں اور چار جنرلوں کو انگریزوں کے پاس یرغمال رکھنا تھا۔ اگر ٹیپو نے یہ شرطیں منظور نہ کیں تو سرنگا پٹم کے قلعے پر قبضہ کرنے کے لیے انگریز خود کو آزاد تصور کریں گے۔ ٹیپو نے ان شرائط کو مسترد کر دیا۔

3 مئی 1799 کو انگریزوں نے قلعے کی دیواروں میں توپوں سے شگاف کر دیا۔ اگر چہ ان کے پاس رسد ناکافی تھا اور فوجی وسپاہی لاغر ہو گئے تھے لیکن میر صادق کی مدد سے انھوں نے حملہ کر دیا۔ پروفیسر حسن لکھتے ہیں کہ اس جنگ کے دوران ٹیپو پیادہ پا رہا اور ادنا سپاہی کی طرح لڑتا رہا۔ لیکن جب اس کے سپاہیوں نے بالکل ہمت ہار دی تو وہ گھوڑے پر سوار ہو کر دریا کے بند پر پہنچا اور لڑتا رہا۔ انگریز مورخ ولکس کا بیان ہے کہ ''ٹیپو اگر چاہتا تو آسانی سے فرار ہو سکتا تھا کیونکہ آبی پھاٹک قریب ہی تھا'' لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس دوران وہ تین مرتبہ زخمی ہوا، تیسری بار اس کے سینے پر بائیں جانب زخم آیا۔ اس کے گھوڑے نے بھی زخمی ہو کر اس کی رانوں کے نیچے دم توڑ دیا۔ اس موقعے پر اس کے خادموں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ دشمن پر اپنی شخصیت ظاہر کر دے لیکن اس مشورے کو اس نے مسترد کر دیا۔ ''انگریزوں کا قیدی بننے سے وہ مرنا بہتر سمجھتا تھا۔'' ''اس اثنا میں ایک گولی اس کی کنپٹی پر لگی اور اس کا کام تمام ہو گیا۔'' ''موت کے بعد ٹیپو سلطان کے چہرے سے وقار یا ایک طرح کی درشتی ٹپک رہی تھی جو اسے عام لوگوں سے ممیّز کرتی تھی۔'' ایک دوسرے شاہد کے مطابق ''اس کے خد وخال سے نہ تو جذبات کا ہیجان ٹپک رہا تھا اور نہ زندگی کا چراغ گل ہونے سے وہ مسخ ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر غیر معمولی وقار اور خلوص سایہ فگن تھا..... اس کے چہرے سے وہ طمانیت اور خوش خلقی ٹپک رہی تھی جس کے لیے وہ زندگی میں ممتاز رہا تھا۔''

میر صادق اپنی غداریوں کا پھل کھانے کے لیے زندہ نہیں رہا۔ اس نے بھاگ کر انگریزوں سے جا ملنا چاہا لیکن میسوری سپاہیوں نے جنھیں یقین تھا کہ

سلطان کے ساتھ اس نے غداری کی ہے، اس کا کام تمام کر کے بھیانک انداز میں اس کی تکا بوٹی کر ڈالی۔ دفن کے بعد لوگوں نے اس کی لاش کھود نکالی اور کوئی دو ہفتوں تک لوگ اس کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کرتے رہے۔ مرد، عورتیں اور بچے تماشا دیکھنے آتے اور اس پر کوڑا کرکٹ پھینک جاتے۔ آج بھی ٹیپو کا احترام کرنے والے جب سرنگا پٹم جاتے ہیں تو اس مقام پر پتھر پھینکتے ہیں جہاں میر صادق مارا گیا تھا۔

پروفیسر حسن نے ٹیپو سلطان کے نظم و نسق اور معاشیات سے متعلق اس کی پالیسیوں اور نظریات سے بھی بحث کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ دوسرے ہندستانی حکمرانوں کی طرح ٹیپو بھی مطلق العنان تھا اگر چہ وہ اہم معاملات میں اپنے خاص خاص فوجی و غیر فوجی افسران سے صلاح و مشورہ کرتا تھا لیکن ان مشوروں پر عمل درآمد کرنا ضروری نہیں تھا۔ آخری فیصلہ وہ خود کرتا تھا'' سلطنت کے جملہ قانونی، عدالتی اور انتظامی اختیارات اسی کے ہاتھ میں تھے۔ وہ خود اپنا وزیر خارجہ تھا اور تمام اہم مراسلت وہ خود کرتا تھا۔ وہ اپنی فوج کا کمانڈر انچیف بھی تھا۔ جنگ کے وقت فوج کی اصل کمان اسی کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ مختلف محاذوں پر لڑنے کے لیے جن جنرلوں کو وہ بھیجتا تھا وہ اسی کے احکام کی پابندی کرتے تھے۔ وہی اپیل کی سب سے بڑی عدالت بھی تھا اور امیر و غریب کے ساتھ یکساں انصاف کرتا تھا۔''

اپنی رعایا کی بھلائی کے لیے اس نے سماجی اصلاح کا بیڑہ بھی اٹھایا۔ اس نے اپنی قلمرو میں شراب اور دوسری منشیات کے استعمال کو ممنوع قرار دیا۔

ٹیپو نے اپنی قلمرو کو'' سلطنت خداداد'' کا نام دیا تھا لیکن اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ وہ صرف مسلمانوں کے لیے ہی تھی بلکہ مسلمانوں پر شرع محمدی کے مطابق اور ہندوؤں پر ان کے مذہبی قوانین کے مطابق حکومت کی جاتی تھی جن میں اس نے کبھی مداخلت نہیں کی۔ اس نے اپنی رعایا کو مکمل مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔

مرکز میں سات خاص کچہریاں یا محکمے تھے۔ ہر محکمہ ایک بورڈ ہوتا تھا اور ہر بورڈ کا علاحدہ علاحدہ اجلاس ہوتا تھا۔ تمام فیصلے ووٹوں کی اکثریت سے ہوتے تھے۔ وہ تجارت و صنعت میں غیر معمولی دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک صنعت کو فروغ دے کر ہی ملک طاقت ور بن سکتا تھا۔ اس کے پاس ایک باضابطہ مستقل فوج تھی جو نظام اور مرہٹوں کے مقابلے میں بہتر، مسلح اور تربیت یافتہ اور زیادہ جنگ آزمودہ تھی۔ اپنی حکومت کے آخری دور میں اس نے ایک بحریہ قائم کرنے کی طرف بھی توجہ دی۔

اگر چہ بعض مورخوں نے ٹیپو کو عدم رواداد، متعصب اور غضب ناک متشدد سلطان کہا ہے لیکن ''ریاست اور مذہب'' کے عنوان سے ایک الگ باب پروفیسر حسن نے قلم بند کیا ہے جس میں انھوں نے یہ دکھلایا ہے کہ'' ٹیپو متعصب نہیں بلکہ ایک روشن خیال حکمراں تھا، جس نے اپنی حکومت میں ہندوؤں کو اعلا مناصب عطا کیے۔ انھیں پرستش کی مکمل آزادی دی، بت تراشنے کے لیے رقمیں دیں اور ایک موقعے پر تو مندر تعمیر کرنے کا بھی حکم دیا۔ اس نے بھی اپنے باپ حیدر علی کی طرح مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے الگ رکھا اور شاذ و نادر ہی اس نے انتظامی معاملات میں اپنے ذاتی عقائد کو اثر انداز ہونے دیا۔ نمک حرامی اور غداری کرنے والی مسلمان رعایا کے ساتھ بھی وہ یکساں سختی برتتا تھا۔''

پروفیسر حسن نے معروضی انداز میں ٹیپو سلطان کے ہر پہلو پر قلم اٹھایا ہے اور اپنی ہر دلیل کو مختلف حوالہ جات سے ثابت کیا ہے۔ ان کی یہ سعی انتہائی کامیاب ہے جس نے ٹیپو کی مثبت اور واضح تصویر پیش کی ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی قابل تعریف ہے اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان قابل تحسین ہے کہ اس نے اسے اردو میں شائع کیا۔

•

جدید ہندستان (1885-1947) / سُمِت سرکار

صفحات: 506، قیمت: 314/- روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1 آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: اسفر فریدی

ماضی کے حالات و واقعات جہاں حال میں جینے کا حوصلہ دیتے ہیں وہیں مستقبل کے لیے لائحہ عمل تیار کرنے میں بھی ممد و معاون ہوتے ہیں اور ماضی کے حالات سے آشنائی تاریخ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی سے تعلق رکھنے کے باوجود تاریخ کا حال اور مستقبل سے رشتہ بڑا گہرا ہوتا ہے۔ اسی لیے تاریخ کے ایک عام طالب علم کا امریکہ کے مشہور صنعت کار ہنری فورڈ کے اس قول پر کہ "History is Bunk" تعجب کرنا غلط نہیں۔ کیونکہ فورڈ کے مطابق ماضی میں جو کچھ درست ہوا وہ تو حال میں شامل ہے لیکن جو غلطیاں ہوئیں انھیں بھلا دیا گیا، اور بھلائی گئی چیزوں کو یاد کرنا لا حاصل ہے۔ فورڈ ایک کامیاب صنعت کار ضرور تھے لیکن تاریخ کے متعلق ان کی رائے تسلیم کر لینے سے تہذیب و تمدن کے مٹ جانے کا خطرہ تو لاحق ہوگا ہی ساتھ ہی ساتھ انسان اپنے روشن مستقبل کا راستہ بھی بھول جائے گا۔ تاریخ کا مطالعہ اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ یہ معلوم ہو سکے کہ ماضی میں علم، سائنسی ترقی، قوت، اقتدار اور دوسری سہولیات کا

کس طرح بے دریغ استعمال کر کے چند افراد نے کثیر آبادی کا استحصال کیا۔ تاریخ جب اپنی اور اپنے وطن کی ہو تو اس کی اہمیت اور بھی دو چند ہو جاتی ہے۔ ہندستان کی تحریک آزادی سے کم و بیش آخری 60 برسوں کا احاطہ کرتی سمت سرکار کی تصنیف کردہ کتاب ''جدید ہندستان (1947-1885)'' کی اہمیت و افادیت اس لیے بھی اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ مصنف نے اس دور کی تقریباً تمام تحریکوں کو بھرپور انداز میں اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

پروفیسر سمت سرکار اس قبیل کے مورخوں میں ہیں جنھوں نے تاریخ نگاری کو حقیقت نگاری کا روپ دیتے ہوئے پورے معاشرے کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ پروفیسر سرکار کا شمار مارکسی نظریے کے حامل مورخوں میں ہوتا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ ان جیسے تاریخ نویسوں کو کسی مخصوص نظریے تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ انھیں آفاقی انسان دوست مورخ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پروفیسر سرکار نے اپنی تحریروں میں جہاں تاریخ کے مشہور و معروف کرداروں کا تجزیہ کیا وہیں انھوں نے معاشرے کے اس طبقے کی تحریکوں کا بھی جائزہ پیش کیا ہے جسے عام طور پر پسماندہ قرار دیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ سلطنت برطانیہ کے زیرنگیں ہندستان میں تقریباً پورا ہندستانی معاشرہ ہی انگریزوں کی نظر میں پسماندہ تھا۔ اگر برطانوی حکومت کے اہلکاروں نے ریاستوں اور رجواڑوں کے نوابوں اور راجاؤں کو تھوڑی بہت اہمیت دیتے ہوئے اپنے قریب جگہ دی تھی تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ان مٹھی بھر ہندستانیوں کو اپنی ہی طرح اعلا سمجھتے تھے، اس کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ وہ ان نوابوں اور راجاؤں کے توسط سے پورے ہندستانی معاشرے کا استحصال کر سکیں۔ انگریز اپنی اس حکمت عملی کے ذریعے بہت دنوں تک کامیاب بھی رہے۔

''جدید ہندستان (1947-1885)'' سے انگریزوں کی اس حکمت عملی کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب تک عام ہندستانیوں میں سلطنت برطانیہ کے خلاف غم و غصہ پیدا نہیں ہوا تھا تب تک برطانوی حکام کانگریس کو مٹھی بھر تعلیم یافتہ ہندستانیوں کی تنظیم قرار دیتے ہوئے اسے قابل اعتنا سمجھنے سے انکار کرتے رہے تھے۔ ہاں اس میں بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ شروع میں کانگریس کے ایجنڈے میں بھی ہندستان اور ہندستانیوں کی آزادی کا مطالبہ شامل نہیں تھا۔ لیکن ایک طرف برطانوی حکام کی بڑھتی ہوئی آمریت اور دوسری طرف حد سے زیادہ استحصال کا شکار ہو رہے ہندستانی عوام کے جوش جنوں نے برطانوی سلطنت کے سورج کو زوال کے راستے پر لا کر کھڑا کر دیا۔ مہاتما گاندھی اور ان کے رفقا کی رہنمائی میں کسانوں، مزدوروں اور حتی کہ انگریزوں کے چبائے اور پھینکے ہوئے ٹکڑوں کو فخر کے ساتھ اٹھانے والے نوابوں اور راجاؤں کے تحریک آزادی میں شامل ہو جانے اور بین الاقوامی حالات کے زیر اثر 1947 میں ہندستان آزاد ہو گیا۔ لیکن تحریک آزادی کو پروفیسر سرکار نے بجا طور پر آزادی سے قبل اور بعد میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور تقسیم ملک کی وجہ سے ناکام قرار دیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ ہماری تحریک آزادی میں حصہ لینے والوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ جس ہندستان کی آزادی کے لیے وہ اپنی جانوں کی قربانیاں دے رہے ہیں وہ حصول آزادی کے وقت آگ و خون کے دریا میں ڈوب کر دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی نے جس ''رام راجیہ'' کا خواب دیکھا تھا وہ آج بھی بعض شدت پسند رہنماؤں کی وجہ سے فرقہ وارانہ آگ کے شعلوں میں لپٹا ہوا ہے۔ پروفیسر سمت سرکار نے آٹھ ابواب پر مشتمل اپنی اس کتاب میں نئی نسل کو موجودہ حالات کا محاسبہ کرنے کے لیے اس طرح کی ڈھیر ساری اطلاعات یکجا کر دی ہیں کہ 1947 تک کوئی بھی ہندستانی بری فوج میں بریگیڈیر کے عہدے تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس اعتبار سے جدید ہندستان کا مطالعہ ضرور کیا جانا چاہیے تاکہ حالات کا صحیح ادراک ہو سکے اور غلطیوں کو درست کرتے ہوئے ہم ایک نئے اور واقعتاً آزاد ہندستان کی تعمیر کو ممکن بنا سکیں۔ قوی امید ہے کہ اگلے ایڈیشن میں کمپوزنگ اور پروفنگ کی غلطیاں درست کر لی جائیں گی۔

•

بجلی کی کہانی / اے. کے. چکرورتی، ایس. سی. بھٹاچاریہ

مترجم: شبانہ اسلام
صفحات: 87، قیمت: 18/- روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1
آر. کے. پورم، نئی دہلی-66
مبصر: عبدالرب

اردو میں سائنسی اور تکنیکی معلومات پر مبنی کتابیں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ دوسری زبانوں سے تراجم کے ذریعے یہ کمی کسی حد تک پوری ہوتی ہے لیکن یہ کافی نہیں۔ اسی طرح ادب اطفال کی بھی اردو میں بے حد کمی ہے کچھ اداروں نے اس سلسلے میں خصوصی توجہ دی ہے لیکن ان کی کوششیں بھی کافی نہیں ہیں اور ادب اطفال سے عام بے اعتنائی کا احساس اب بھی ہوتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے چلڈرن بک ٹرسٹ اور بچوں کا ادبی ٹرسٹ اشتراک سے کافی کتابیں اس مقصد کے تحت شائع کی ہیں۔ تاکہ بچوں کی خاطر خواہ تربیت بھی کی جا سکے اور سائنسی معلومات کی سطح پر بھی وہ کسی سے پیچھے نہ ہوں اور جس طرح سائنسی علوم پر دوسری زبانوں میں مواد ملتا ہے،

اردو میں بھی دستیاب ہو۔ ''بجلی کی کہانی'' بھی اسی سلسلے کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں بہت آسان زبان میں تھیلس (Thales) کی دریافت سے موجودہ عہد تک کی بجلی کی داستان قلم بند کی گئی ہے۔ تھیلس 600ق.م. میں یونان میں پیدا ہوا اور اس کا تجربہ بجلی کی دریافت کے سلسلے میں نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب میں اس کے تجربات کا ہی بیان نہیں بلکہ اس کی عام زندگی اور طرزِ فکر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تھیلس کے بعد ڈاکٹر گلبرٹ (1544-1603) کا ذکر ہے جن کی کتاب "De Magnet" خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر گلبرٹ ''بجلی کی سائنس کے بابا آدم'' کہے جاتے ہیں۔

گلبرٹ کے بعد ''اوٹو وون گیورک'' کے تجربات کا بیان ہے جو میگ برگ کے میئر تھے اور انھوں نے بھی بجلی کی دریافت کے سلسلے میں اہم رول ادا کیا۔ اس کے بعد مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے رائیل انسٹی ٹیوشن سائنس داں سر ہمفری ڈیوی کے تجربات پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کی تحقیقات سے کیمیاوی سائنس میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور بجلی کی انوکھی طاقت کو استعمال کرنے کا ایک نیا طریقہ وجود میں آیا۔ اسی طرح ٹیلی گرافی کے اشارات، الیکٹرون، ریڈیو کیلی گرافی وغیرہ پر بھی دلچسپ انداز میں گفتگو کی گئی ہے اور الیکٹرونکس کے میدان میں آنے والی انقلابی کامیابیاں بیان کی گئی ہیں۔ اس طرح ''بجلی کی کہانی'' میں اب سے تقریباً پچیس سو برس قبل یونان کے ایک باشندے تھیلس سے لے کر عہدِ حاضر تک کے ارتقائی مراحل کو آسان زبان میں پیش کیا ہے اور ان تجربات کو تصویروں کی زبانی بھی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

اس آسان اور عام فہم ترجمے کے لیے مترجم شبانہ اسلام مبارکباد کی مستحق ہیں اور امید ہے کہ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دوسری کتابوں کی طرح مقبول ہوگی۔

•

اردو تعلیم اور اسکول/ فیروز بخت احمد

صفحات: 251، قیمت:-/200 روپے

ناشر: اے-202، ادیبہ مارکیٹ اینڈ اپارٹمنٹس، مین روڈ، ذاکر نگر، نئی دہلی-110025

مبصر: رئیس احمد

''اردو تعلیم اور اسکول'' فیروز بخت احمد کے 46 بصیرت افروز مختصر مگر جامع مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں بیشتر مضامین کا مرکز ومحور اردو تعلیم، اردو ذریعۂ تعلیم، اور مسلمانوں میں گرتے ہوئے تعلیمی معیار کے اسباب، جیسے اہم موضوعات ہیں۔ علاوہ ازیں بعض مضامین کو مصلح قوم سرسید احمد خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، مرزا غالب، شیخ محمد ابراہیم ذوق اور حکیم عبدالحمید جیسی علمی وادبی شخصیات کے اہم پہلوؤں اور ان کی زندگی کے ان چھوٹے گوشوں کے لیے مختص کیا گیا ہے، ساتھ ہی ہمارے مدرسوں، خانقاہوں اور قدیم درسگاہوں کی صحیح اور سچی مگر افسوسناک صورتِ حال کو موضوعِ بحث بنانے کے ساتھ ساتھ دینی مدارس میں ترمیم نصاب، پر بھی خاطر خواہ توجہ صرف کی گئی ہے۔

اس اعتبار سے ''اردو تعلیم اور اسکول'' کے جملہ مضامین نہ صرف قابلِ توجہ ہیں بلکہ ان کا حرف حرف ''فکر وعمل'' کا متقاضی ہے اور تاریک وسنسان راہوں میں چراغِ راہ سے کم نہیں۔ ''اردو میڈیم اسکولوں کا گرتا معیارِ تعلیم'' کے حوالے سے صاحبِ مضمون نے جن حقائق کا انکشاف کیا ہے وہ یقیناً چونکا دینے والے ہیں۔ مثال کے طور پر مضمون نگار نے دہلی اور دیگر ریاستوں کے اردو میڈیم اسکولوں کے نتائج کو پیش نظر رکھا ہے، ان کے مطابق دہلی کے تمام اردو میڈیم اسکولوں کا مجموعی نتیجہ پندرہ بیس فیصد سے زیادہ نہیں بلکہ کم ہی رہا، انفرادی طور پر اگر دیکھا جائے تو دہلی میں طالبات کے زینت محل سینئر سیکنڈری اسکول کا نتیجہ محض 8 فیصد رہا مزید برآں ان کامیاب طالبات کے نمبرات تھرڈ ڈویژن سے زیادہ نہیں تھے۔ اسی طرح جامع مسجد اسکول کی بارھویں کلاس کے طلبہ کا نتیجہ صرف 11 فیصد رہا اور اینگلو عربک اسکول میں طلبہ کا دسویں کا نتیجہ 24 فیصد اور 9 فیصد نتیجہ طالبات کے چاندنی محل اسکول کا رہا۔ اگرچہ دہلی کے ان اردو میڈیم اسکولوں کے نتائج نہایت مایوس کن ہیں، مگر ملک کی دیگر ریاستوں کے اردو میڈیم اسکولوں کے نتائج کے مقابلے میں قدرے بہتر ہیں۔ بلاشبہ ان خراب نتائج کے لیے والدین، اساتذۂ کرام اور محکمۂ تعلیم بھی یکساں ذمّے دار ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اردو میڈیم اسکولوں کے نظم وضبط اور ان کی بہتری کے لیے کارگر اور مناسب اقدامات نہ تو محکمۂ تعلیم کی جانب سے کیے جاتے ہیں، اور نہ ہی اردو زبان وادب اور ذریعۂ تعلیم کی بڑھ چڑھ کر حمایت ووکالت کرنے والے افراد ہی اس جانب توجہ دیتے ہیں۔ ان حالات میں والدین اور اساتذۂ کرام نااُمیدی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ ان حوصلہ شکن حالات میں اردو ذریعۂ تعلیم کے طلبہ وطالبات کے لیے روشن مستقبل کے آثار وامکانات معدوم ہوجاتے ہیں۔ فیروز بخت احمد نے اس مضمون کے تعلق سے اردو میڈیم اسکولوں کو درپیش مشکلات ومسائل کے حل کے لیے ''عمل پیہم'' اور ''یقین محکم'' کے تناظر میں ''زکوشش بہر چیز خواہی رسید'' کے مصداق چند اہم تجاویز پیش کی ہیں، جن کی تفصیلات کا یہاں موقع نہیں۔

اگرچہ سرسید احمد خاں کے کارہائے نمایاں اور ان کے تعلیمی افکار ونظریات پر سیر حاصل بحثیں ہوچکی ہیں، لیکن صاحبِ مضمون نے ''سرسید ایک مصلح قوم اور مفکر تعلیم'' کے عنوان سے سرسید کی فکری اساس اور ان کے تعلیمی تصورات پر منطقی

اور استدلالی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ سر سید احمد خاں نے کہا تھا کہ اسلام ہی ایسا فطری اور سائنٹفک مذہب ہے جو زمان کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے، قومیں وہی زندہ رہتی ہیں جو یادِ ماضی کو بھلا کر روشن مستقبل کے لیے کوشاں رہیں اور اس مقصد میں کامیابی و کامرانی کے لیے عصری علوم کی حصولیابی ایک اہم ذریعہ ہے۔

''ہندستانی انتظامیہ میں مسلمانوں کی نمائندگی'' ایک فکر انگیز موضوع ہے۔ سچائی یہ ہے کہ تعلیمی سرگرمیوں اور مقابلہ جاتی امتحانات میں مسلم طلبہ و طالبات شریک ہی نہیں ہوتے ہیں اور اگر ہوتے بھی ہیں تو محض خانہ پُری کے طور پر۔ اس تشویشناک صورت حال میں مسلم طلبہ کی بہتر نمائندگی کی توقع مفقود ہو جاتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ یہ حالات ہمارے خود ساختہ ہیں اور ان حالات کی ذمے داری بھی پوری مسلم قوم ہے جس میں قوم کا ہر فرد برابر کا شریک ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم قوم ایک بہتر اور مثبت سوچ و فکر کے ساتھ آگے قدم بڑھائے اور اپنا ایک لائحہ عمل مرتب کرے جس کی روشنی میں منزلِ مقصود کی جانب نہ صرف بڑھا جا سکتا ہے بلکہ یہ چند بڑھتے ہوئے قدم یقیناً ''کارواں'' میں بھی تبدیل ہوں گے۔ مصنف نے اس مضمون میں چند اعداد و شمار بھی پیش کیے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندستان کی تمام ریاستوں میں صرف 15 مسلم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہیں اور 8 ڈسٹرکٹ پولس چیف ہیں۔ اسی طرح صدر جمہوریہ ہند کے سکریٹریٹ میں 32 افسران میں سے صرف ایک ہی مسلمان ہے۔ وزیر اعظم کے دفتر میں 13 افسروں میں سے صرف 1 مسلم ہے۔ یونین پبلک سروس کمیشن میں 15 افسران میں سے ایک مسلمان ہے، پلاننگ کمیشن کے 37 افسران میں سے محض 2 مسلم ہیں۔ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے آئی اے ایس، آئی پی ایس، اور آئی ایف ایس کے عہدوں میں مسلمانوں کی نمائندگی صرف 2 فیصد ہے۔

ضرورت ہے کہ مسلم قوم تعلیم کی اہمیت و افادیت کو سمجھتے ہوئے اپنے بچوں کو جو ہر ملک و قوم کا مستقبل ہوا کرتے ہیں حصولِ علم کے لیے راغب کریں اور بہتر سے بہتر اعلا تعلیم کے لیے ان کی ضرورتوں کو پورا کریں، قوم کے صاحبِ حیثیت افراد بھی اس کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

اس مجموعے کے بعض دیگر مضامین ــــ ''نئی نسل کی تعمیر میں اساتذہ کا کردار''، ''تعلیم کے تئیں بڑھتی ہماری بے حسی''، ''تنزلی سے مزید تنزلی کی جانب بڑھتے اردو میڈیم اسکول''، ''اسلام سائنس سے متصادم نہیں''، ''ترقی کے راستے پر گامزن ہمارے مدارس اسلامیہ، جدید تعلیم کا حصول مسلمانوں کی پسماندگی دور کر سکتا ہے''، ''بچوں کا ادب اور بے حس اردو داں''، اور ''تکنیکی تعلیم کی اہمیت'' بطورِ خاص قابلِ مطالعہ ہیں اور مصنف کی فلسفیانہ، دانشورانہ فکر اور مثبت نظریات کی غمازی کرتے ہیں۔ جو اس کتاب کا ایک نمایاں وصف ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اس کتاب کی اپنی اہمیت و انفرادیت ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ ہر صاحبِ دل کو مسلم قوم کی زبوں حالی اور اردو تعلیم کی شکستہ حالی کو دور کرنے کے لیے جھنجھوڑتا ہے۔ ان مضامین کی اشاعت میں قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کا جزوی مالی تعاون بھی شامل رہا ہے، اس لحاظ سے ناشر (مصنف) اور قومی اردو کونسل یکساں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

●

صدائے آبجو / ارشد عبدالحمید

صفحات: 176، قیمت: -/150 روپے

ناشر: انیس کتاب گھر، نال والی مسجد، امیر گنج، ٹونک۔ 304001

مبصر: ارشد علی خاں

''صدائے آبجو'' ارشد عبدالحمید کی اولین شعری پیش کش ہے جس میں ان کی 66 غزلیں، 29 نظمیں اور 24 دوہے شامل ہیں۔ کتاب کے شروع میں جناب مخمور سعیدی کا مضمون ''اجاڑ علاقوں میں آبادیوں کا نقیب'' اور جناب شین کاف نظام کا مضمون ''صدائے آبجو میں تیری صورت دیکھتا ہوں میں'' شامل ہیں۔ مخمور سعیدی نے ارشد عبدالحمید کو ''جدیدیت کے نمائندہ شاعروں میں'' شمار کیا ہے جبکہ شین کاف نظام نے ''عصریت اور روایت کی آمیزش (کو) مابعد جدیدیت کی پہچان اور ارشد کی شناخت'' قرار دیا ہے۔ یعنی دونوں نے ارشد کی شاعری کو کسی نہ کسی نظریے سے وابستہ کر کے شاعر کو جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے دائرے میں محصور کر دیا ہے۔ ایک عام سنجیدہ قاری کے لیے کلاسیکیت، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت کی کوئی اہمیت نہیں، اس کی پسند ناپسند کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ زیرِ مطالعہ تخلیق نے اس کے ذہن و دل کو کس طرح اور کتنا متاثر کیا ہے۔

مجموعے میں شامل تخلیقات کی ترتیب کے مطابق میرے خیال میں غزل ارشد عبدالحمید کی ترجیحات میں شامل ہے اور ان کا ذہنی جھکاؤ اس صنف کی جانب زیادہ ہے۔ شاعری میں اسلوب اور آہنگ کے بغیر شاعر کی شناخت ممکن نہیں۔ شاعر کی یہی شناخت اسے دوسروں سے ممتاز بناتی ہے اور شاعر کا اسلوب اس کی مخصوص لفظیات اور تراکیب سے مرتب ہوتا ہے۔ ارشد کی غزلوں میں مستعمل کچھ الفاظ اس طرح ہیں: سلطنت، سلطان، شہزادہ، پیادہ، ریال، دینار و درہم، تخت، کوفہ، غزال اور دیگر۔ یہ سب ایسے الفاظ ہیں جو ذہن کو ایک خاص عہد اور معاشرے کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ مخمور سعیدی کے الفاظ میں: ان کا سرا شاعر کے اس تاریخی شعور سے بھی جا ملتا ہے جس کا سفر یوں تو صدیوں سے جاری ہے

لیکن جس کا قریبی حوالہ اس ہند اسلامی تہذیب کو سمجھنا چاہیے جو دلّی میں مغل سلطنت کے دورِ زوال اور اودھ میں وہاں کے تازہ دم تمدن کے عروج کے دنوں میں پروان چڑھی تھی۔'' یہ شعر دیکھیے:

جو ملا تو کچھ بھی ملا نہیں، جو گیا تو کچھ بھی گیا نہیں
مری سلطنت خس و خار کی، مرا تخت کاہ و سفال کا
مرے پاس لہو کا سونا ہے، مرے پاس نمو کی چاندی ہے
میں مُلکِ سخن کا شہزادہ مجھے مال و منال سے کیا لینا
کیا فرزیں ہاتھی کیا گھوڑے، اک شاہ کے بدلے سارے گئے
مرا قلعہ ریت کا ڈھیر ہوا، مرے پیدل مفت میں مارے گئے
ریالِ خواب لٹاتی ہے دونوں ہاتھوں سے
امیرِ شوق مجھے آزمانا چاہتی ہے
تمام لشکرِ عقل و نگاہ کھیت رہا
بساطِ عشق پہ سلطان رہ گیا ہے بس

ارشد کے اسلوب و آہنگ کے تعین میں درج بالا اور ایسے دوسرے بہت سے الفاظ کے ساتھ کچھ ہم آہنگ و ہم صوت الفاظ، جو بہت زیادہ آتے ہیں، وہ ہیں: ہُو، لُہو، نَمو، عَدُو، جُو، خُو، بُو، آرزُو، جستجُو، رُو۔ یہ سب الفاظ اپنا ایک خاص آہنگ رکھتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہ یہ الفاظ ان کے ہر شعر میں کسی نہ کسی طور پر آئے ہیں لیکن اکثر اشعار ان سے مسجع ہیں اور یہ شعر کا آہنگ بڑھانے میں معاون ہوئے ہیں:

یہ کس کو یاد کیا روح کی ضرورت نے
یہ کس کے نام سے میرے لہو میں پھول کھلے

ارشد کے شعری کینوس پر ماضی اور حال کے کچھ ناقابلِ فراموش لیکن دھندلے مناظر بھی پھیلے ہوئے ہیں جن میں شاعر اپنے خونِ جگر سے ایسے رنگ بھرتا ہے کہ ہر منظر جیتا جاگتا ہماری آنکھوں میں روشن ہو جاتا ہے:

شہر جانے والی پگڈنڈی کو تکتا رہ گیا
گانو کی چوپال میں برگد اکیلا رہ گیا

ارشد کی غزل میں تراکیب کی نُدرت بھی ہے اور یہ تراکیب رائج شعری زبان سے نامانوس ضرور ہیں لیکن ارشد کے یہاں ان کا استعمال ایسا رچا بسا ہے کہ اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔

ارشد کا اسلوب و آہنگ نمایاں کرنے میں ان کا ایک اور شعری وصف ان کے بڑے کام آتا ہے، یہ وصف ہے: رعایت و تضادِ لفظی اور مناسبات۔ جن کا دل کش مظاہرہ جابجا دیکھنے میں آتا ہے۔ کئی بار ان کے یہاں عمومی خیال بھی اس اہتمام کے باعث بڑا دل نواز بن جاتا ہے۔ یہ شعر دیکھیے:

کوئی تو چاند ان آنکھوں کی گہری جھیل میں اُترے
لبوں کی کشتیوں میں پھول سی مسکان رکھ جائے

کہا جا سکتا ہے کہ جہاں ارشد عبدالحمید کی مخصوص تراکیب اور مناسبات لفظی ان کے اسلوب کی پہچان بنتے ہیں وہیں ان کی خاص شعری لفظیات ان کا آہنگ طے کر دیتی ہیں۔

ارشد کی نظموں کے بارے میں شین کاف نظام کی رائے ہے: ''ارشد کی نظمیں ایک تربیت یافتہ قاری کا مطالبہ کرتی ہیں۔ فارم کی سطح پر بھی وہاں عروضی ارکان کی تکرار سے زیادہ آہنگ پر توجہ ہوتی ہے۔''

ارشد کی نظموں کی فضا ان کی غزلوں سے یکسر جداگانہ ہے یہاں تک کہ ان کی وہ مخصوص شعری لفظیات، جو ان کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ہے، نظموں میں بہت کم ہی نہیں، مفقود ہے۔ مخمور سعیدی کے بقول نظموں میں ارشد عبدالحمید کی ''زبان بول چال کی زبان سے زیادہ قریب ہے۔'' البتہ ان کی نظموں اور غزلوں میں منظرنگاری قدرِ مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے۔ جس طرح ان کے اشعار میں منظرنگاری کے کچھ نایاب نمونے ملتے ہیں اسی طرح وہ اپنی نظموں میں بھی کچھ ایسے منظر ہماری نظروں کے سامنے سے گزارتے ہیں جنھیں پڑھ کر ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے:

جھیل کے کنارے/ چاند کے عکس پر جھکی ہوئی شاخِ گلاب
اوک سے جب خوشبوئیں پلاتی ہے
تیرے ساتھ جاگی ہوئی/ دل کو پہلی رات یاد آتی ہے (پہلی رات)

ارشد کی نظموں کا دوسرا وصف ان کا طنزیہ پہلو ہے جو ان کی غزلوں میں اتنے واشگاف انداز میں ظاہر نہیں ہوتا جتنا نظموں میں ہوتا ہے اور اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ نظم میں ارشد کی گفتگو تلمیح اور استعارے کی چادر میں لپٹی ہوئی نہیں ہے۔ ان کی نظمیں ''تنقید''، ''چشم قلم'' سردار جعفری کی یاد میں''، ''دخل درمعقولات''، ''سپردگی''، ''قوسین میں پھنسی عبارت''، ''نارسائی''، ''اعتماد''، ''انقلاب زدہ''، ''شیر امداد علی کا مینڈک''، ''اب بھی'' میں طنز کے واضح نشانات موجود ہیں جبکہ دوسری کئی نظموں میں اس کی زیریں لہروں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مجموعے کے آخر میں چوبیس دوہے بھی شامل ہیں۔ شاعر کا یہ نقشِ اول عام قاری پر اپنا خوشگوار اثر چھوڑتا ہے۔

□□□

بلراج پوری　　　　بچوں کا گوشہ

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انھیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ذیل میں کونسل کی شائع کردہ کتاب "سائنس دانوں کی کہانیاں" سے اقتباس پیش کیا جارہا ہے۔

اس کتاب میں ارسطو، گیلیلیو، پاسچر، ڈارون، نیوٹن، میری کیوری اور آئنسٹائن جیسے شہرہ آفاق سائنسدانوں کے بارے میں واقفیت فراہم کرائی گئی ہے۔ اس کتاب کی مدد سے بچوں کو نہ صرف ان سائنسدانوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوں گی بلکہ ان ایجادات سے بھی واقف ہونے کا موقع ملے گا جنھوں نے انسان کو نت نئی سہولیات فراہم کیں۔ کونسل کی شائع کردہ 52صفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف 13 روپے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو 40فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

میری کیوری (1934-1867)

شاید کسی بیٹی نے شہرت اور علم کی اتنی سیڑھیاں طے نہیں کیں۔ 36 برس کی عمر میں ایک نوبل پرائز، آٹھ برس بعد دوسرا نوبل پرائز، ایک سو سے اوپر اعزازی ڈگریاں، بیسیوں دیگر انعامات اور تمغے، اخباروں کی سرخیوں میں اتنی بار نام، معتقدوں کے ہجوم آدم کے کسی بیٹے کے حصے میں بھی نہیں آئے۔

زندگی کے 17ویں سال میں اس نے زندگی سے بھاگ جانے کی خواہش کی کیونکہ "جن دیواروں سے ہم سر پھوڑتے ہیں وہ ہمارے سروں سے زیادہ مضبوط ہیں"۔ نامرادیوں کی گود میں پلی زندگی محبت کی ٹھوکر سہہ نہ سکی۔ مگر آخرکار ناکامیوں اور تلخیوں سے اس کی دوستی اتنی گہری ہوگئی کہ جب قسمت نے اس کی زندگی کو پلٹا دینا چاہا تو اس نے گھبرا کر کہا۔ "مجھے میری شہرت سے بچاؤ، اس نے میری زندگی حرام کردی ہے"۔

میری کیوری کے رتبے کے سائنسداں اور بھی گزرے ہوں گے، اس سے بہتر انسان بھی قدرت نے پیدا کیے ہوں گے، اس سے زیادہ کامیاب بیویاں اور مائیں بھی دنیا میں ضرور ہوئی ہوں گی مگر ایک ہی شخصیت میں ذہانت، انسانیت، پیار اور ممتا کی اتنی مقدار کبھی سمیٹی نہیں جاسکی۔

ایسی شخصیت کی تربیت کے لیے قدرت نے پوری فیاضی سے اپنی آزمائشیں پیش کیں۔ میری نے 1867 میں ایک بہادر مگر مظلوم دیش میں، ایک صاحب علم مگر غریب گھرانے میں جنم لیا۔ جب روس کی برتر فوجی طاقت کے مقابلہ میں پولینڈ اپنی آزادی نہ بچا سکا، تو میری کے محب الوطن باپ کو وارسا کے ایک اسکول کی نوکری سے بھی محروم ہونا پڑا۔ پانچ ذہین بچوں کے سوا اس کے پاس کوئی دولت نہ تھی۔

میری کو اپنے پہلے دس برس میں دو اور صدمے ملے۔ بڑی بہن اور ماں کی جدائی، دونوں موتیں بیماری کے ہاتھوں ہوئیں مگر مفلسی بھی موت کی سازش میں شریک تھی۔ چار بڑھتے ہوئے پیٹوں کے لیے ایندھن، چار ابھرتی جوانیوں کو ڈھکنے کے لیے کپڑے اور چار کھلتے ہوئے ذہنوں کے لیے علم حاصل کرنے کے واسطے غریب باپ نے جو ہاتھ پاؤں مارے اس سے اولاد کی ہمت بھی متحرک ہوئے بغیر نہ رہی۔ ہائی اسکول کے امتحان میں چار میں سے تین بچے سونے کا تمغہ لے کر پاس ہوئے۔ تیسرا تمغہ سب سے چھوٹے بچے میری نے حاصل کیا تھا۔

دن رات کی پڑھائی سے میری کی صحت گر گئی۔ زندگی کا اگلا مرحلہ شروع کرنے سے پہلے باپ نے اسے کسی رشتے دار کے پاس صحت بحال کرنے بھیجا۔

زندگی کی جدو جہد سے کوسوں دور، نو جوان ساتھیوں کی صحبت میں، حسین قدرت کی آغوش میں، سولہ سال کی دوشیزہ مستی سے جھوم اٹھی۔ اس نے ساری جوانی کا نشہ ایک ہی گھونٹ میں پی لیا اور چند لمحوں کے لیے ساری دنیا کو بھول گئی۔

''مجھے یقین نہیں آتا کہ الجبرا اور جیومیٹری نام کی کوئی بلائیں بھی دنیا میں ہیں۔ میرے ذہن کو انہوں نے خالی چھوڑ دیا ہے۔'' میری نے اپنی ایک سہیلی کو لکھا۔ ناچ و گانے کی محفل میں اسے دن اور رات کا فرق بھول جاتا۔ سیر سپاٹے میں فاصلے اور راستے کی پابندی نہ رہتی۔ شرارتوں میں جائز اور ناجائز کی تمیز غائب۔ اور جنوں کا یہ عالم طاری رہتا کہ اسے محسوس ہوا'' ہمیں تو کسی پاگل خانے میں ہونا چاہیے تھا''۔

میری کا یہ سال اس کے سب سالوں سے الگ تھلگ ہے۔ یوں لگتا ہے، اس نے ایک خواب دیکھا، جس میں اس نے اپنی اگلی پچھلی زندگی کی ساری کمیاں پوری کرنے کی کوشش کی۔ اس کی لڑکی ماں کی کہانی لکھتے ہوئے قدرت کا شکریہ ادا کرتی ہے کہ ریاضت اور ضبط کی خشک نصف صدی گزارنے سے پہلے اسے موقعے بھی نصیب ہوئے، جب ایک ہی ناچ ناچتے ہوئے اس کے جوتوں کے تلوے ختم ہو گئے۔ کون جانے ایک سال میں جو شیرینی اس نے حاصل کی وہ زندگی بھر کے کڑوے گھونٹ پینے میں کہاں تک مددگار ہوئی۔

خواب ختم ہو گیا۔ میری اور اس کی بہن برونیا کو پیرس جا کر اعلا تعلیم حاصل کرنے کی امنگ پیدا ہوئی۔ ادھر گھر کی مالی حالت ایک کا بوجھ بھی برداشت کرنے کے قابل نہ تھی۔ میری نے تجویز کیا کہ وہ کچھ عرصہ نوکری کر کے بہن کا خرچہ بھیجے گی۔ پڑھائی پورا کرنے پر بہن میری کا خرچہ برداشت کرے گی۔

وارسا کے باہر اسے کسی گھرانے میں بچے پڑھانے کی نوکری مل گئی۔ تنخواہ کا زیادہ حصہ بہن کو چلا جاتا۔ اس نے اپنی ضرورتیں اس حد تک کم کر لیں کہ ڈاک خرچ بچانے کے لیے بھائی کو خط دیر سے لکھنے لگی۔ اس نوکری کے دوران میں مالک کا بڑا لڑکا یونیورسٹی کی چھٹیوں میں گھر آیا۔ اس نے گھر میں ایک جوان خوب صورت لڑکی دیکھی جو اپسرا کی طرح ناچتی اور عالم کی طرح باتیں کرتی تھی۔ محبت کا جواب محبت نے دیا۔ مگر میری کی سونی زندگی کو بہار کا یہ جھونکا ہرا نہ کر پایا۔ کیونکہ مالکن کو یہ گوارا نہ تھا کہ اس کا خاندانی لڑکا ایک استانی اور نوکرانی سے بیاہ کرے۔ ادھر لڑکے میں حکم عدولی کی ہمت نہ تھی۔ میری کا جواں دل ٹوٹ گیا۔ اس عالم میں اس نے ایک خط میں ''اس گھٹیا دنیا کو خیر باد'' کہنے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر پھر دل کے ٹکڑے جوڑے اور ان پر پتھر باندھ کر اپنا کام جاری رکھا۔

برونیا نے ڈاکٹری پاس کر لی اور اپنے ایک طالب علم سے شادی کر لی۔ وعدہ نبھانے کے لیے اس نے میری کو مزید تعلیم کے واسطے پیرس بلایا۔ میری کا دل اچاٹ تھا مگر بہن کے بہت اصرار پر وہ پیرس چلی گئی۔ جہاں 23 سال کی عمر میں وہ کالج میں داخل ہوئی۔

ایک سستے کرایہ کے مکان میں، جہاں روشنی تھی نہ پانی، اس نے چار برس بتائے۔ ناکافی کپڑوں کی وجہ سے اسے راتوں کو بے حد سردی لگتی۔ ناکافی خوراک اور کافی کام کی وجہ سے ایک بار اسے بے ہوش پایا گیا۔ بہن اور بہنوئی اسے اپنے پاس رکھنے پر رضامند نہ کر سکے۔ اسے اپنی پڑھائی اور فاقہ مستی کی زندگی میں کوئی خلل پسند نہ تھا۔ جماعت کا کمرہ، لیبارٹری، کتابیں اور اپنی اندھیری کوٹھری اس کی ساری کائنات تھے۔ مگر اس کے علم کا دائرہ فزکس، کیمسٹری، ریاضی، شاعری، موسیقی اور ستاروں کے جہاں تک وسیع ہوتا جا رہا تھا۔

تیسیار اس آئی۔ میری ایم اے کے امتحان میں اول رہی۔ فزکس کے بعد اگلے سال اس نے ریاضی میں ایم اے کیا، جس میں دوسرا مقام پایا۔ اب زندگی میں کوئی اور ارمان نہ تھا، سوائے مزید پڑھائی اور مزید ریسرچ کے۔ شادی اور مرد کے دو الفاظ اس نے اپنی لغت سے نکال دیے۔ سوائے پروفیسروں کے کسی مرد سے اس کا واسطہ نہ تھا۔

پیرس میں ایک نوجوان سائنس داں پیری کیوری بھی رہتا تھا۔ اس کی زندگی کا ارمان بھی سائنس تھا۔ شادی اور عورت کے الفاظ اس کی ڈکشنری سے بھی غائب تھے۔ '' کیونکہ ذہین عورتیں نایاب ہیں اور باقی عورتیں کوئی بھی غیر معمولی راستہ اختیار کرنے میں حائل ہوتی ہیں'' 35 سال کی عمر تک وہ محبت سے ناآشنا تھا۔

ایک بار کسی پروفیسر کے گھر دونوں کی ملاقات ہوگئی۔ بات چیت سائنس کے موضوع سے شروع ہوکر ایک دوسرے میں دلچسپی تک جا پہنچی۔ چند ملاقاتوں کے بعد پیری نے شادی کی تجویز رکھی۔ میری کا مرجھایا دل دوسری محبت سے فوراً کھل نہ سکا مگر سال بھر کی ٹال مٹول کے بعد اس نے پیری کی محبت کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

سائنس دانوں کا یہ جوڑا عاشقوں کا جوڑا بھی بن گیا۔ سائنس سے ان کے مشترکہ عشق نے ان کے باہمی عشق کو ایک گرہ لگا دی۔ میری نے اپنے خاوند کا ذکر کرتے ہوئے اپنی بہن کو ایک بار لکھا'' خواب میں بھی اس سے بہتر خاوند کا تصور نہیں ہوسکتا۔ مجھے کبھی وہم وگمان بھی نہ تھا کہ ایسا خاوند ملنا ممکن ہے۔ وہ قدرت کا بہترین تحفہ ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارا پیار بڑھتا جاتا ہے''۔

میری نے گھر بار سنبھالا۔ اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی پھر دوسری۔ مگر اس کے سائنس سے متعلق کام میں کوئی کمزوری نہ آئی۔ فولاد میں مقناطیسی طاقت پیدا کرنے کے مسئلے پر اسے ایک وظیفہ ملا اور فزکس میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے بھی اس نے مطالعہ شروع کیا۔ ہنری بیکول نے مشاہدہ کیا تھا کہ یورینیم سے ایسی کرنیں نکلتی ہیں، جو ٹھوس اور غیر شفاف چیزوں کو بھی پار کر جاتی ہیں۔ ان کرنوں کی نوعیت کا مطالعہ میری کی ڈگری کا مضمون تھا۔

ایک ٹوٹی پھوٹی لیبارٹری میں میری نے اپنے خاوند کی امداد سے تجربے شروع کیے۔ سب سے پہلے اس نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ کیا ریڈیائی کرنیں صرف یورینیم سے نکلتی ہیں۔ سبھی عناصر پر تجربہ کر کے اس نے دریافت کیا کہ تھورانیم سے بھی ایسی کرنیں نکلتی ہیں۔

اپنے تجربوں میں، اس نے یہ بھی دیکھا کہ یورینیم اور تھورینیم کے کئی مرکبوں میں ریڈیائی عمل ان کی مقدار کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے۔ اس سے اسے شک ہوا کہ کہیں ان مرکبوں میں کسی نئے نامعلوم عنصر کی ملاوٹ نہ ہو۔

کیمسٹری میں نئے عنصر کی تلاش، نئی دنیا تلاش کرنے سے کم اہم نہیں۔ میری کیوری اور پیری کیوری کا نیا عزم ان سمندری جہاز رانوں کی طرح تھا، جو ان دیکھے نئے سمندروں میں نئے ساحلوں کی کھوج میں لنگر ڈال دیتے تھے۔

چونکہ نئے عنصر کے وجود کے بارے میں شک یورینیم کے مرکب سے ہوا تھا، اس لیے اس کی تلاش یورینیم کی کان میں ہی ہوسکتی تھی۔ مگر جس دھات سے یورینیم الگ کیا جاتا تھا، نیا عنصر غالباً اس کا دس لاکھواں حصہ تھا۔ بھاری مقدار میں اتنی بیش قیمت دھات تجربوں کے لیے حاصل کرنا میری اور اس کے خاوند کے بس میں نہ تھا۔ انھیں یہ خیال سوجھا کہ چونکہ نیا عنصر یورینیم سے مختلف ہے، اس لیے یورینیم نکالنے کے بعد جو کنکری بچتی ہے، اس میں اس کا ہونا عین اغلب ہوگا۔ یہ کنکری انھیں مفت مل گئی۔

چار برس تک دو دماغ اور چار ہاتھ سیکڑوں من کنکری پر طرح طرح کے تجربے کرتے رہے۔ آگ کے چولھوں پر ابلتی کڑاہیوں میں بیلچے بھر کر ڈالتے ہوئے، ابالی صاف کنکری پر مختلف تیزابوں اور دوائیوں کے عمل کو دیکھتے ہوئے اور دیگر بیسیوں تجربوں میں انھیں دن سے رات ہو جاتی اور کبھی کبھی رات سے دن۔ اُن دنوں کا ذکر کرتے ہوئے میری نے لکھا'' ہمارے پاس نہ روپیہ تھا نہ ڈھب کی لیبارٹری اور نہ کوئی امداد۔ یہ دن ہماری مشترکہ زندگی کے سب سے بہادرانہ باب تھا۔ اس بے آرام لیبارٹری میں ہماری زندگی کے بہترین اور مسرور ترین لمحے گزرے ہیں''۔

چار برس کی کڑی ریاضت پھل لائی۔ انھیں ایک کے بجائے دو عنصر مل گئے۔ ایک کا نام میری نے اپنے پیدائشی ملک پولینڈ کے نام پر پولونیم رکھا اور دوسرے کا ریڈیم۔ ان دریافتوں نے دنیا بھر میں ہلچل مچادی۔

ریڈیم دنیا کی سب سے قیمتی دھات ثابت ہوا۔ مگر اس کے موجدوں نے نہ اس کا نسخہ پوشیدہ رکھا اور نہ جملہ حقوق محفوظ رکھے۔ اس طرح انھوں نے کروڑوں روپے کی آمدنی پر یہ کہہ کر لات ماردی کہ انسانی بھلائی کی چیزیں کسی فرد کی ملکیت نہیں ہونی چاہئیں۔

مگر ان دریافتوں نے ان کے لیے شہرت اور عزت کی راہیں کھول دیں۔ سن 1903 میں انھیں دنیا کا سب سے بڑا انعام نوبل پرائز ملا،

جس کی آمدنی سے انھوں نے اپنے قرضے چکائے اور ایک مکمل لیبارٹری بنانا شروع کی۔ پیری کو یونیورسٹی کی پروفیسری مل گئی اور کچھ عرصے بعد سائنس اکادمی کی ممبری۔ میری کو ان دریافتوں پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل ہوگئی۔

نئی شہرت سے خوش ہونے کے بجائے میری نے شکایت کی کہ اس سے ''ہماری پُرامن اور پُرمحبت زندگی منتشر ہوگئی ہے''۔

اعزازی تقاریب اور اپنی مجلسی اہمیت سے منہ موڑ کر سائنس کے یہ عاشق پھر اپنے عشق میں جٹ گئے۔ اب انھوں نے ریڈیم کی خاصیتوں پر کھوج شروع کی۔ ریڈیم کی ریڈیائی طاقت یورینیم سے بیس لاکھ گنا پائی گئی جس کی کرنیں سخت ترین چیز کو پار کر جاتی ہیں۔ اس کی ریڈیائی طاقت کی گرمی ایک گھنٹہ میں اپنے وزن کے برابر برف پگھلا دیتی ہے اس سے ہیرا چمک دار بن جاتا ہے۔ جس سے اصلی اور نقلی ہیرے کی پہچان ہو جاتی ہے۔ یہ کئی قسم کے جراثیم ہلاک کر دیتا ہے اور کینسر جیسے موذی مرض کو نیست و نابود کر سکتا ہے۔ ریڈیم کی ایجاد نے فزکس، کیمسٹری، جیولوجی، علم نباتات اور علم ادویات کے پھیلاؤ کے لیے نئے دروازے کھول دیے۔

ایک لمبے سفر کے بعد میری اور پیری کا جوڑا عشق، علم اور شہرت کی ہموار سطح پر آگے بڑھنے لگا۔ کون جانے کتنے نئے فاصلے کس نئی رفتار سے طے ہوتے، ایک منحوس حادثہ نے جوڑا ہی توڑ دیا۔ 19 راپریل 1906 کو پیری کیوری سڑک پار کرتے ہوئے تانگے اور موٹر کے بیچ میں آکر کچلا گیا۔ میری کی ساری دنیا روندی گئی۔ پیری کے پیار سے جس دل نے زندگی پائی تھی، آج وہ مسلا گیا تھا۔ جو کمر آج ٹوٹی وہ پھر سیدھی نہ ہو پائی۔ ایک سال بعد، میری اپنی ایک سہیلی کو لکھتی ہے ''میری زندگی کو ایسی چوٹ لگی ہے، کہ کبھی سنبھل نہ پائے گی۔ مجھے اپنے بچوں کی پرورش کا ضرور دھیان ہے وہ اتنے حسین، پیارے اور اچھے ہیں۔ مگر وہ بھی مجھ میں زندگی کی تڑپ بحال نہیں کر سکتے''۔

پیری کی یاد اسے پھر لیبارٹری میں لے گئی۔ اس نے من مار ا اور نئے تجربے شروع کر دیے۔ میری نے ریڈیائی کرنوں کی خاصیتوں کے ذریعے ریڈیم کی مقدار ناپنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ اس نے ریڈیم کے عملی فوائد پر تحقیق کی۔ 1910 میں اس نے ریڈیائی قوت پر ایک سیر حاصل کتاب لکھی جس کے 970 صفحات پر اس نے ریڈیم کے بارے میں سارا علم قلم بند کر دیا۔ کتاب کے سرورق پر پیری کی تصویر تھی۔ دو سال پہلے اس نے اپنے خاوند کی یاد میں پیری کیوری کے کارنامے نام کی چھ سو صفحات کی ایک کتاب شائع کی تھی۔

بجھے دل کی چنگاریوں کی ضیا پھیلنے لگی۔ میری کی شہرت آسمانوں کو چھونے لگی۔ اسے اپنے خاوند کی جگہ یونیورسٹی میں پروفیسری مل گئی۔ 1911 میں اسے ایک اور نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ اس کے بعد انعامات، تمغوں اور اعزازی ڈگریوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دنیا کے ہر ملک، ہر یونیورسٹی اور سائنس کے ہر ادارے نے میری کو خراج تحسین ادا کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہی۔

1914 کی جنگ عظیم میں میری کی شخصیت کے کچھ اور روپ نکھرے۔ ریڈیائی طاقت اور ایکس رے کو پہلی بار اس نے انسانی خدمت کے لیے استعمال کیا۔ وہ اپنے ساز و سامان کے ساتھ زخمی کیمپوں میں زندگی کا پیغام بن کر پہنچی۔

شکر گزار قوم اور ممنون انسانیت نے میری کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔

فرانس کی اکادمی نے پہلی بار بغیر چناؤ کے اسے ممبری پیش کی۔ ملک ملک سے دعوت نامے اور اعزازات پھر ملنے شروع ہو گئے۔ 1920 میں سارا امریکہ سواگتی جوش میں پاگل ہو اٹھا۔ صدر جمہوریہ امریکہ نے اپنی قوم کی طرف سے نذرانہ عقیدت کے طور پر ایک لاکھ ڈالر کی قیمت کا ایک گرام ریڈیم میری کو بھینٹ کیا۔ چند سال بعد یہ بھینٹ دہرائی گئی۔ میری نے ان تحائف سے پیرس اور وارسا میں تجربہ گاہیں قائم کیں۔

میری کیوری نے اپنی جسمانی طاقت کا ہر حصہ سائنس کی خدمت کے لیے وقف رکھا۔ مگر 67 غیر معمولی برسوں کے بوجھ اور ایک نا قابل تشخیص بیماری نے زندگی کا سارا رس نچوڑ لیا۔ جولائی 1934 میں اس پُرسوز اور رومان انگیز سائنسداں کے دن پورے ہو گئے۔

مرض کی تشخیص ہوگئی، مگر مریض کی موت کے بعد، میری اپنی ہی دریافت.....ریڈیائی عمل.....کا شکار ہوئی!

□□□

میلے کی افتتاحی تقریب میں کونسل کی طرف سے چلائے جانے والے کمپیوٹر سینٹروں کے طلبہ کے لیے جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا جس میں دہلی کے 11 سینٹروں کے طلبہ کو اسناد دی گئیں۔ اس موقعے پر جناب ارجن سنگھ دہلی کے تمام کمپیوٹر سینٹروں میں اوّل مقام حاصل کرنے والے جمیعت علمائے ہند کمپیوٹر سینٹر، دہلی کے طالب علم محمد عابد حسین کو میمنٹو دیتے ہوئے۔ ساتھ میں پروفیسر مشیر الحسن کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

کتاب میلے کے دوران ایک مذاکرہ بعنوان "اردو سنگیت اور محمد رفیع کے نغمے" منعقد کیا گیا جس میں مشہور و معروف فلم ہدایت کار اور پروڈیوسر جناب مہیش بھٹ، ممتاز فلم ڈائرکٹر جناب اروِن کول، جناب عزیز برنی، جناب زبیر رضوی اور جناب انوار احمد خاں نے شرکت کی۔ اس موقعے پر مشہور نقاد، ادیب اور شاعر جناب شمس الرحمن فاروقی (وائس چیئر مین قومی اردو کونسل) کی کتاب "تنقیدی افکار" کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ تصویر میں (دائیں سے) جناب زبیر رضوی، جناب شمس الرحمن فاروقی، جناب عزیز برنی، جناب مہیش بھٹ اور جناب اروِن کول۔

URDU DUNIYA Monthly, April 2005, Vol. 7, Issue: 4
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi

[illegible]

[illegible]

Printed and Published by Director, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at J.K. Offset Printers, Jama Masjid, Delhi-110006 and Published at NCPUL, West Block-I, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110 066, Editor Dr. M. Hamidullah Bhat. Tel : 26103381, 26103938